بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب میں

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات قرآن حکیم کی روشنی میں دئے گئے ہیں:

(1) کیا حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے؟

(2) کیا وہ ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور قیامت کبریٰ برپا ہونے سے کچھ عرصہ قبل دوبارہ واپس تشریف لائیں گے اور زمین پر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم کریں گے؟

(3) کیا تثلیث پرستوں کو حضرت عیسیٰؑ کے متبعین قرار دیا جا سکتا ہے؟

(4) کیا قرآن مجید میں مذکورہ ''جن'' انسانوں اور فرشتوں کے مابین ایک خیالی، پوشیدہ، اور نظر نہ آنے والی مخلوق کے معنی میں لئے جا سکتے ہیں؟

(5) حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں ''طیر'' کا لفظ کن معنی میں استعمال کیا گیا ہے؟

(6) کیا قرآن حکیم میں ''النمل'' چیونٹیوں کے معنی میں ہے یا یہ لفظ ایک قبیلہ کا نام ہے؟

(7) کیا سورہ تکویر کی ابتدائی آیات قیامت کبریٰ کے واقعات پر مشتمل ہیں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

ما رأیکم فی هذا الکتاب؟ نحن فی إنتظاره

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ط

ڈاکٹر اسرار احمد اور جاوید احمد غامدی کی قرآن فہمی

تنقیدی جائزہ

عصمت ابو سلیم

سر سید میموریل لائبریری، باغبانپورہ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى

ڈاکٹر اسرار احمد اور جاوید احمد غامدی کی قرآن فہمی

تنقیدی جائزہ

عصمت ابو سلیم

سرسیدؒ میموریل لائبریری، باغبانپورہ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

نام: ڈاکٹر اسرار احمد اور جاویداحمد غامدی کی قرآن فہمی

مصنف: عصمت ابو سلیم

تعداد: پانچ صد

طبع: اول مارچ 2005

ناشر: سرسیدؒ میموریل لائبریری، باغبانپورہ، لاہور

مطبع: حمایت اسلام پریس ریلوے روڈ طبع ہوا۔

قیمت: 30روپے مکتبہ اخوت، نزد حسن مارکیٹ (مچھلی منڈی)

اردو بازار لاہور۔فون 7235951

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے زیر نظر قرآنی دروس اور محترم جاوید احمد غامدی کے خطاب کے مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی بعض آیات کے مقامی ترجمہ سے بالاستیعاب استقصاء کے بغیر، اپنے مطلب کا مفہوم اخذ کرنے کے عادی ہیں اور کسی موضوع پر قرآنی آیات کی دوسرے مقامات پر تصریحات کو پیش نظر نہیں رکھتے اور یوں **افلا یتدبرون القرآن** کے مصداق بنے ہوئے ہیں، جسکی وجہ سے ایک طرف تو صحیح مفہوم تک رسائی نہیں ہوتی اور دوسری طرف قرآن میں تضادات کا گمان ہونے لگتا ہے۔ **قرآن مجید اللہ تعالیٰ وتسامی کا قول ہے اور صحیفہ فطرت اس کا فعل، جن میں مطابقت ضروری ہے، آیات قرانیہ میں کوئی تناقض نہیں۔**

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے زیر بحث دو مقالات سے، جو ان کے دو عدد قرآنی دروس پر مشتمل ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور قیامت کبریٰ سے کچھ پہلے دوبارہ دنیا میں آکر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم کریں گے، شادی کریں گے اور صاحب اولاد ہوں گے۔ حالانکہ قرآن مجید سے ان باتوں میں سے کسی کی تائید نہیں ہوتی۔ فنائے عالم سے کچھ عرصہ قبل، جس میں نہ جانے کتنے اربوں سال لگیں گے، عیسیٰؑ کے ہاتھوں چند سالہ خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کے خواب دکھا کر اور اس کا انتظار کرا کر مسلمانوں کو فی الوقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کی تلقین سے اغیار کو اسلامی ممالک پر دھیرے دھیرے جھوٹ، فریب اور طاقت کے بل بوتے پر قبضہ کر کے انہیں محکوم بنانے اور ان کے وسائل پر کنٹرول حاصل کرتے چلے جانے کی جرأت ہو رہی ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سب مسلمان ممالک متحد ہو کر بزور قوت سپر

پاور امریکہ اور اسکے اتحادیوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیں۔ مزید تفصیلات کے لئے اس موضوع پر میری کتاب ''ابن مریمؑ'' کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔

محترم جاوید احمد غامدی کو پرویز مرحوم سے شکایت ہے کہ وہ جنوں کو نہیں مانتے، سلیمانؑ کے لشکر میں طیر کے معنے پرندے نہیں لیتے اور نمل کو جس کے معنے چیونٹیاں ہیں ایک قبیلہ کا نام سمجھتے ہیں۔ غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ جن ایک معروف لفظ ہے۔ اس معروف لفظ کا معنی المنجد نے ایک پوشیدہ غیر مرئی خیالی مخلوق بتایا ہے۔ قرآن مجید میں ''جن'' بایں معنی استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ''جن'' بھی وہی اناج، سبزیاں اور پھل کھاتے ہیں، جو ہماری خوراک کا لازمی جزو ہیں (1) قرآن میں جنوں کے لئے بھی وہی سزائیں اور انعامات ہیں جو دنیاو آخرت میں ہمارے لئے مقرر ہیں۔ جنوں کے لئے وہی رسل وانبیاء ہیں جو ہماری ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور جو سب کے سب بشر تھے۔ اگر جن انسانوں کے علاوہ کوئی اور مخلوق ہیں تو انکے لئے رسول اور انبیاء بھی جن ہونے چاہئیں۔ قرآن میں جن قوم کے انسان سلیمانؑ کے لشکر میں بطور سپاہی اور افسر شامل تھے اور انکے لئے عمارتیں، قلعے، مجسمے اور برتن بنانے والے مزدور، معمار، مجسمہ ساز۔ لوہار اور

---

(1) اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورہ الرحمٰن کی آیت 3 اور 4 میں انسان کی تخلیق اور بیان کی تعلیم کا ذکر کرکے آیات 10 تا 12 میں فرمایا والارض وضعھا للانام o فیھا فاکھۃ والنخل ذات الاکمام o والحب ذو العصف والریحان o زمین کو (اللہ تعالیٰ نے) خلقت کے فائدے کے لئے رکھا، اس میں میوے اور غلاف والی کھجوریں ہیں اور بھس والا اناج اور خوشبودار نباتات ہیں پھر آیت 13 میں فرمایا فبای آلاء ربکما تکذبان: پھر تم (اوپر مذکور انسان کے ہر دو فریق) اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ ربکما اور تکذبان، تثنیہ کے صیغے ہیں اس سے انسان کے دو فریق مراد لینے کی تائید آیات 14 اور 15 سے ہوتی ہے۔ آیت 14 میں انسان اور آیت 15 میں جنوں کی پیدائش کا ذکر ہے کہ وہ کیسے بنائے گئے اور آیت 16 میں فبای آلاء ربکما تکذبان کی تکرار ہے۔ آیت 13 میں جن نعمتوں کی تکذیب کے متعلق سوال کیا گیا ہے وہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے انکا ذکر آیات 11 اور 12 میں ہے۔ یہ نعمتیں انسانوں اور جنوں کے لئے یکساں ہیں۔ اناج، نباتات سبزیاں اور پھل وغیرہ کھیتوں اور باغوں میں کاشت کئے جاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ان کے مالک چھوٹے زمیندار، بڑے زمیندار، جاگیردار وڈیرے فوجی افسر، وزراء اور بیوروکریٹ، اسمبلیوں کے ممبر وغیرہ ہوتے ہیں۔ گویا ان میں سے بعض انس اور بعض جن ہیں۔

ٹھیکیروں کا کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جن جنوں نے قرآن سنکر اسکی تبلیغ شروع کر دی تھی وہ انسان یہودی کاہن تھے۔ جو جن سلیمانؑ کے دربار میں ملک کے اصلی باشندوں کی نمائندگی کرتے تھے، وہ انسان ہی تھے، غیر مرئی اور خیالی مخلوق نہیں تھے۔ قرآن مجید اور لغت کے مطابق طائر دو قسم کے ہیں، ایک وہ جسے قرآن نے طائر یطیر بجناحیہ کہا ہے یعنی پرندہ، دوسرا سریع السیر کے معنے میں ہیں۔ سلیمانؑ کے لشکر میں طیر سریع الحرکت فوجی دستوں کے معنی میں ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاسوسی کے فرائض بھی سرانجام دیتے تھے۔ ہدہد ایک Intellegence افسر تھا، جس نے سلیمانؑ کو بڑی اہم اور مفید معلومات فراہم کی تھیں اور قاصد کے فرائض بھی سرانجام دیئے تھے۔

''النمل'' کا معنی چیونٹیاں ہے جس طرح مازن کا معنی چیونٹیوں کے انڈے ہے، لیکن یہ دونوں دو قبیلوں کے نام بھی ہیں۔ چیونٹی قوت گویائی سے محروم ہے، جسکی کوئی آواز نہیں۔ لاکھوں چیونٹیاں ایک جگہ جمع ہو کر محو گفتگو ہوں تو آپ انکی کوئی آواز نہیں سن سکتے۔ سلیمانؑ نے انکی آواز کیسے سن لی؟ ایک چیونٹی کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ سلیمانؑ چیونٹیوں پر یلغار کے لئے لشکر لئے آرہے ہیں؟ وہ چیونٹی نہیں تھی بلکہ اپنے قبیلہ کی سربراہ تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں، اس نے اپنے قبیلے کے لوگوں کو جو کچھ کہا، اسکے لئے ذوی العقول یعنی انسانوں کے لئے مخصوص صیغے استعمال کئے جیسے ادخلوا مساکنکم ..... لا یحطمنکم۔ چیونٹیوں پر لشکر کشی سلیمانؑ پر بہتان ہے۔ ملاؤں کے نزدیک قرآن مجید کلیلہ و دمنہ اور الف لیلہ و لیلہ جیسی من گھڑت داستانوں کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا:

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ سائنس اور ترقی کے موجودہ دور میں بھی ایسے علماء پائے جاتے ہیں جو ایسی ہی جہالت اور توہمات سے پُر باتیں کرتے ہیں، جیسی ملاؤں سے سننے میں آتی ہیں یہ کتاب اسی موضوع پر ہے۔

المفتقر الی اللہ الرحمٰن

عصمت ابو سلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ڈاکٹر اسرار احمد کی قرآن فہمی

ایک تنقیدی جائزہ

اس تحریر کا باعث و محرک محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن پر مشتمل دو مقالے ہیں، جو ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' کی جلد 13 کے شمارہ 23 اور شمارہ 26 میں شائع ہوئے اور جن کی کاپیاں مجھے ایک وسیع المطالعہ اور دینی ذوق کے حامل دوست نے فراہم کیں۔

میری محدود معلومات کے مطابق جناب ڈاکٹر اسرار احمد جماعت اسلامی سے منسلک تھے، بعد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر اس سے علیحدہ ہو گئے اور تنظیم اسلامی کے نام سے اپنے متقدیوں پر مشتمل ایک جماعت قائم کی، جس کے وہ آجکل سربراہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے قرآنی درس پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی نشر ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایم بی بی ایس ہونے کے ساتھ ساتھ ایم اے اسلامیات بھی ہیں اور ہفت روزہ ''ندائے خلافت'' انکی تنظیم اسلامی کا ترجمان ہے۔

خاکسار کو ڈاکٹر صاحب کے عیسیٰؑ کے بارے افکار سے پہلی بار آگاہی مذکورہ بالا مقالات پڑھ کر ہوئی۔ انکا پہلا مقالہ سورۃ آل عمران کی آیات 42 تا 48 اور دوسرا مقالہ سورۃ آل عمران کی آیت 55 کے ترجمہ اور تفسیر پر مشتمل ہے۔

ان دو مقالات کے مطالعہ سے جو تاثر قائم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے پہلے سے موجود قرآنی تراجم اور تفاسیر سے مستفاد مفہوم کو اپنے لفظوں میں بیان کر دیا ہے، خود قرآن مجید پر غور و تدبر سے کام نہیں لیا اور نہ ہی متعلقہ موضوع پر قرآن مجید میں وارد دیگر آیات کو پیش نظر رکھا ہے۔ علاوہ ازیں سیاق و سباق کو بھی نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ سیاق و سباق کی زبردست اہمیت ہے۔

موجودہ تفاسیر اور انکی روشنی میں کئے گئے تراجم روایات پر مبنی ہیں۔ یہ تفسیری روایات اکثر و بیشتر وضعی ہیں، جو اس لئے گھڑ کر پھیلائی گئیں کہ مسلمانوں کو قرآن کے حقیقی مفہوم سے دور رکھا جائے، یہ دشمنان اسلام کی ایک سوچی سمجھی سازش تھی، جو عروج اسلام کے ساتھ ہی شروع کر دی گئی تھی، لیکن ابتداء میں زیر زمین چلتی رہی اور اس کے نتائج آہستہ آہستہ رونما ہونے لگے۔ اور بالآخر مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے، جو سو سال کے قلیل عرصہ میں ربع مسکون کے ایک بڑے خطہ پر چھا گئے تھے اور وہاں انہوں نے ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کرتے ہوئے عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کر دی تھی۔

پہلا مقالہ: پہلے ذیل میں سورۃ آل عمران کی آیات 42 تا 48، انکا ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (42) يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (43) ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ (44) اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (45) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (46) قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (47) وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (48)

ڈاکٹر صاحب کا ترجمہ: "اور جب فرشتوں نے (مریم سے) کہا کہ مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور جہان کی عورتوں میں منتخب کیا ہے۔ مریم اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا اور سجدہ کرنا اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنا۔

(اے محمد) یہ باتیں اخبار غیب میں سے ہیں جو ہم تمہارے پاس بھیجتے ہیں اور جب وہ لوگ اپنے قلم (بطور قرعہ) ڈال رہے تھے کہ مریم کا متکفل کون بنے تو تم انکے پاس نہیں تھے اور نہ اُس وقت ہی اُن کے پاس تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب فرشتوں نے (مریم سے کہا) کہ مریم خدا تم کو اپنی طرف سے ایک فیض کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح (اور مشہور) عیسیٰ ابن مریم ہوگا (اور جو دنیا اور آخرت میں باآبرو اور (اللہ کے) خاصوں میں سے ہوگا۔ اور ماں کی گود میں اور بڑی عمر کا ہو کر (دونوں حالتوں میں) لوگوں سے گفتگو کرے گا اور نیکوکاروں میں سے ہوگا۔ مریم نے کہا پروردگار میرے ہاں بچہ کیونکر ہوگا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تو لگایا نہیں۔ فرمایا کہ اللہ اسی طرح جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو ارشاد فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ اور وہ انہیں لکھنا (پڑھنا) اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی تفسیر: اور یاد کرو وہ وقت جب فرشتوں نے کہا اے مریم یقیناً اللہ نے تمہیں چن لیا ہے اور تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہیں چن لیا ہے تمام جہان کی خواتین پر۔ تو اے مریم! اب تم اپنے رب کی فرمانبرداری کرتی رہو اور سجدہ کیا کرو اور جھکنے والوں کے ساتھ جھکتی رہا کرو یعنی نماز با جماعت کے اندر شریک ہوا کرو۔ اور اے محمد ﷺ یہ بات غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپؐ پر وحی کر رہے ہیں۔ اور آپؐ تو ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ یہ طے کرنے کے لئے اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ مریم کس کی کفالت میں رہے گی۔ وہاں دوسرے Priest بھی تھے۔ ان میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ یہ بچی جسے اللہ کے نام پر وقف کر دیا گیا ہے، میری تحویل میں رہے۔ لیکن جب قلم پھینک کر فیصلہ کرنا طے ہوا جیسے کہ زائچہ وغیرہ تیار کرتے ہیں یا اس طرح کی کوئی اور صورت تو اللہ نے حضرت زکریاؑ کا نام نکال دیا۔ اور اے نبیؐ! آپ اس وقت بھی موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ اب یاد کرو وہ وقت جب فرشتوں نے مریم سے کہا! یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دے رہا ہے ایک ایسی ہستی کی جو اس کی جانب سے خاص کلمہ ہوگا۔ اس کا نام ہوگا مسیح عیسیٰ بن مریم۔ وہ باعزت ہوگا اور

دنیا اور آخرت میں مرتبے والا بھی۔ وہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ اور وہ لوگوں سے گفتگو کرے گا، گود میں بھی اور کہولت کی عمر میں بھی اور وہ یقیناً ہمارے نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔ کہولت کی عمر کو تو حضرت مسیح دنیا میں پہنچے ہی نہیں۔ 33 برس کی عمر تھی کہ وہ آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے، جب کہ کہولت کی عمر چالیس سال کے بعد آتی ہے۔ گویا ابھی اس آیت کا تقاضا پورا نہیں ہوا۔ کہولت میں تو سب ہی گفتگو کرتے ہیں، اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی ضرورت یوں تھی کہ جس طرح آپ کا پنگھوڑے میں کلام کرنا عام ضابطے کے خلاف تھا اسی طرح آپ کی کہولت میں گفتگو معجزانہ ہوگی۔ وہ کہولت کی عمر سے پہلے ہی آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے۔ ان پر ابھی موت وارد نہیں ہوئی بلکہ وہ دوبارہ دنیا میں واپس آئیں گے، پھر کہولت کی عمر کو پہنچیں گے، شادی کریں گے، اولاد ہوگی، پھر اُن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نظام خلافت علی منہاج نبوۃ دنیا میں قائم کرے گا۔ اس طرح حضرت مسیح ؑ کا کہولت میں کلام کرنا بھی اُسی طرح غیر معمولی واقعہ ہے جس طرح اُن کا پنگھوڑے میں گفتگو کرنا۔

بیٹا پیدا ہونے کی خبر سن کر حضرت مریم نے کہا اے اللہ! میرے ہاں اولاد کیسے ہوگی، مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ جواب ملا اللہ تعالیٰ اسی طرح تخلیق فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے عام ضابطہ تو یہی ہے کہ اولاد ماں باپ دونوں سے ہوتی ہے مگر اللہ کو کسی شے کی حاجت نہیں، وہ تخلیق میں کسی ضابطے کا پابند نہیں، وہ اسباب اور ذرائع کا محتاج نہیں، بلکہ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے۔ وہ تو جب کسی شے کا ارادہ کرتا ہے تو بس کُن کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو یعنی حضرت عیسیٰ کو کتاب اور حکمت سکھائے گا اور توریت اور انجیل بھی۔ یہاں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل چار چیزیں ہیں ان کے مابین تین واؤ آئے ہیں، ان میں سے دو تو واؤ عطف ہیں اور ایک واؤ تفسیری ہے۔ اللہ اُن کو سکھائے گا کتاب اور حکمت یعنی توریت اور انجیل۔ درمیانی واؤ یعنی کے معنوں میں ہے، یہاں توریت کو کتاب اور انجیل کو حکمت کہا گیا ہے۔ توریت میں صرف احکام تھے، حکمت نہ تھی اور انجیل میں صرف حکمت ہے، احکام نہیں ہیں، اس نکتے کو سمجھ لینے سے ساری گتھی حل ہو جاتی ہے اور اگر اسے نہیں سمجھا تو

پھر ذہنوں میں پریشانی رہتی ہے۔

کہولت اور رفع ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ:

"کہولت کی عمر کو تو حضرت مسیح دنیا میں پہنچے ہی نہیں۔ 33 برس کی عمر تھی کہ وہ آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے، جبکہ کہولت کی عمر چالیس سال کے بعد آتی ہے، گویا، بھی اس آیت کا تقاضا پورا نہیں ہوا، کہولت میں سب ہی گفتگو کرتے ہیں اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسکی ضرورت یوں تھی کہ جس طرح آپ کا پنگھوڑے میں کلام کرنا عام ضابطے کے خلاف تھا۔ اسی طرح آپ کی کہولت میں گفتگو معجزانہ ہوگی۔ وہ کہولت کی عمر سے پہلے ہی آسمان کی طرف اٹھا لئے گئے۔ ان پر ابھی موت وارد نہیں ہوئی بلکہ وہ دوبارہ دنیا میں واپس آئیں گے، پھر کہولت کی عمر کو پہنچیں گے، شادی کریں گے اولاد بھی ہوگی۔ پھر اُن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نظام خلافت علی منہاج النبوۃ دنیا میں قائم کریگا، اسی طرح حضرت مسیح کا کہولت میں کلام کرنا بھی اسی طرح غیر معمولی واقعہ ہے، جس طرح انکا پنگھوڑے میں گفتگو کرنا"

قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف ہے ۔ قرآن مجید میں حضرت مسیح کے آسمان کی طرف اٹھا لئے جانے کا کوئی ذکر نہیں، آیت رَافِعُکَ اِلَیَّ ہے، رَافِعُکَ اِلَی السَّمَاء نہیں یعنی میں تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا فرمایا گیا، میں تجھے آسمان کی طرف اٹھالوں گا نہیں کہا گیا۔ علاوہ ازیں قرآن مجید میں یہ بھی کہیں مذکور نہیں کہ حضرت مسیح " اس دنیا میں کہولت کی عمر کو نہیں پہنچے۔

رہا ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ "33 برس کی عمر تھی کہ وہ آسمان کیطرف اٹھا لئے گئے،" تو اس کے متعلق عرض ہے کہ المنجد میں ہے:

الکھل ، من کانت سنوات عمرہ بین الثلاثین و الخمسین تقریبا

(ادھیڑ عمر شخص وہ ہے جسکی عمر کے سال لگ بھگ تیس سے پچاس کے درمیان ہوں)

جبکہ المعجم الوسیط کے مطابق، الکھل :

من جاوز الثلاثین الی نحو الخمسین

(ادھیڑ عمر شخص وہ ہے جو تیس سے اوپر تقریباً پچاس سال تک کا ہو)

عربی لغات کے مطابق 33 سال ادھیڑ عمری میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن میں 33 سال کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں چالیس سال کی عمر میں نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ آپؐ سے پہلے جتنے نبی تشریف لائے انہیں بھی اس وقت نبی بنایا گیا جب وہ بالغ مرد تھے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ:

وما أرسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم من اھل القری (12/109)

سے واضح ہے۔ آسمان کی طرف زندہ اٹھانے کا مفہوم ڈاکٹر صاحب نے آیت کریمہ رَافِعُکَ اِلَیَّ سے لیا ہے۔ جو سورۃ آل عمران کی آیت 55 ہے، لہٰذا اس پر گفتگو ڈاکٹر صاحب کے دوسرے مقالہ کے تنقیدی جائزہ میں کی جائیگی۔

حضرت عیسیٰؑ کی طبعی وفات۔ حضرت عیسیٰؑ کی ماضی میں طبعی وفات پانے کے ثبوت میں کئی آیات پیش کی جاسکتی ہیں، جن سے ان کے کہولت کی عمر کو پہنچنے سے پہلے آسمان کی طرف اٹھا لئے جانے اور قیامت کبریٰ سے کچھ عرصہ پہلے دنیا میں واپس آنے، اور ان کے ذریعے نظام خلافت قائم ہونے کے متعلق ڈاکٹر صاحب کے غلط دعوی پر مبنی عمارت زمین پر آگرے گی، اور ثابت ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰؑ کے ذریعے نظام خلافت کا قیام عمل میں آئے گا محض ایک خوش فہمی ہے۔ اگر نظام خلافت کے قیام سے ہی مسلمانوں کی بگڑی بن سکتی ہے، تو اس کا یہ ایک مناسب موقع ہے، امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف ایک صلیبی جنگ عرصہ سے شروع کر رکھی ہے اور وہ اس کے نتیجہ میں جھوٹ، فریب اور اپنی عسکری برتری کے بل بوتے پر دو مسلمان ملکوں افغانستان اور عراق پر ہزاروں بے گناہ مردوں عورتوں اور بچوں کے ناحق قتل کے بعد، ناجائز قبضہ کر چکا ہے اور باقی مسلمان ملکوں

میں اپنی فوجیں لا بٹھائی ہیں اور انکو دھمکیاں دے رہا ہے۔ سردست ایران پر حملہ کے لیے پر تول رہا ہے۔ لہٰذا امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہونے کا اس سے بہتر کوئی وقت نہیں۔ سب مسلمان ملکوں کو چاہئے کہ وہ متحد ہو جائیں اور اپنی قوت مجتمع کر کے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے جنگ کر کے افغانستان اور عراق کو ان سے آزاد کرائیں اور جن ملکوں میں انکی فوجیں ڈیرہ ڈالے ہوئی ہیں، ان کو بزور طاقت وہاں سے نکالیں، بصورت دیگر تمام اسلامی دنیا امریکہ اور اسکے اتحادیوں کی ہمیشہ کے لئے غلام بن جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب اس سلسلہ میں کچھ کر سکیں تو یہ ایک مستحسن قدم ہوگا۔ حضرت مسیح ؑ کی دوبارہ دنیا میں خیالی واپسی کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا مسلمانوں کے لئے از حد مہلک ہوگا۔

قرآن مجید میں عیسیٰ ؑ کا یہ قول درج ہے جس میں انہوں نے فرمایا:

واذقال عیسیٰ ابن مریم یٰبنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقالما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعد ی اسمہ احمد (61/6)

(اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں، اپنے سے پہلے آئی ہوئی تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد جو رسول آنے والے ہیں جنکا نام احمد ہوگا انکی بشارت دیتا ہوں)

یاتی من بعد ی کا مطلب ''میری موت کے بعد آنے والا'' ہے۔

سورۃ انبیاء کی آیت 34 میں ہے:

وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد افان مت فھم الخالدون (21/34)

(اور اے پیغمبر) ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقائے دوام نہیں بخشا۔ بھلا اگر تم مر جاؤ تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے) اس سے واضح ہے کہ جس طرح رسول کریم ؐ فوت ہوں گے اسی طرح آپ ؐ سے پہلے بھی کوئی بشر موت سے نہیں بچا۔

ناقابل تردید ثبوت: سورۃ المائدہ کی آیات 116 تا 117 سے ماضی میں حضرت عیسیٰؑ کی طبعی وفات کا ناقابل تردید ثبوت مل جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

واذقال اللہ یعیسی ابن مریم ء انت قلت للناس اتخذونی و امیَ الھین من دون اللہ قال سبحنک ما یکون لی أن اقول ما لیس لی بحق ان کنت قلتہ فقد علمتہ، وتعلم ما فی نفسی و لا اعلم ما فی نفسک انک أنت علام الغیوب(116) ما قلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدو اللہ ربی وربکم و کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شیءٍ شھید(117)

(اور جب اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تم نے (ان) لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لو؟ (عیسیٰؑ) نے کہا کہ تو پاک ہے۔ مجھے کب شایان تھا کہ میں ایسی بات کہتا جسکا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا تھا تو تجھ کو معلوم ہو گا (کیونکہ) جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے اور جو کچھ تیرے جی میں ہے میں اسے نہیں جانتا۔ بے شک تو علام الغیوب ہے۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو، جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے۔ اور میں ان پر اس وقت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے فوت کر لیا (تو اس کے بعد) تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر شے پر حاضر (ناظر) ہے۔"

اذ قال اللہ ماضی کا صیغہ ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سوال و جواب ماضی میں ہو چکے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ جب وہ پہلے مسیحی فوت ہو کر آخرت میں پہنچے جنہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے بعد انہیں اور انکی والدہ کو معبود کا درجہ دے دیا تھا اور اس تعلیم کو عیسیٰؑ سے منسوب کیا، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو، جو اپنی طبعی وفات کے بعد آخرت میں موجود تھے، اپنی پوزیشن واضح کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عیسیٰ کا یہ کہنا کہ: "جب تو نے مجھے فوت کر لیا تو اس

کے بعد تو ہی ان پر نگران تھا، اس معنی کا حامل ہے کہ انہوں نے طبعی وفات پائی ہوئی تھی، عیسائیوں نے ان کی وفات کے بعد اپنے عقیدہ میں بگاڑ پیدا کرلیا، جس کے وہ ذمہ دار نہیں۔

کھلا دھوکا: قرآن مجید میں ہے کہ:

ولئن قلت انکم مبعوثون من بعد الموت لیقولنّ الذین کفروا ان ھذا الا سحر مبین (11/7) (اگر تم کہو کہ تم لوگ مرنے کے بعد زندہ کر کے اٹھائے جاتے ہو، تو کافر کہہ دیں گے کہ یہ تو کھلا دھوکا ہے)۔ چنانچہ بعث بعد الموت ایک امر واقع ہے۔ یوم البعث مرنے کے بعد زندہ کر کے اٹھائے جانے کا دن ہے۔ اس دن کو **یوم القیامۃ** بھی کہا گیا ہے، یوم الدین بھی، یوم الفصل بھی اور یوم الجمع بھی، اور بھی کئی نام ہیں۔ ہزاروں لوگ اس دنیا میں روزانہ مرتے ہیں اور مرنے کے ساتھ ہی وہ دوبارہ زندہ کر کے آخرت میں پہنچ رہے ہیں۔ جیسا کہ مثال کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مما خطیئاتھم اغرقوا فادخلوا نارا (71/25)

(وہ اپنے گناہوں کے سبب غرق آب کر کے آگ میں ڈال دیئے گئے۔)

یعنی حضرت نوحؑ کے نافرمانوں کو سیلاب میں غرق کر کے جہنم رسید کر دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد، آخرت میں زندگی کے لئے خاکی جسم کی ضرورت نہیں روح اصل انسان ہے اور جسم لطیف سے عبارت ہے۔ غرق ہونے والوں کے جسم سیلابی پانی میں گل سڑ گئے یا پانی کے جانور کھا گئے۔

عامۃ المفسرین اور مترجمین نے واذ قال اللہ کو، اور جب اللہ کہے گا کے معنی میں لیا ہے، حالانکہ اس کا کوئی جواز نہیں۔ تاہم اس معنی میں لینے کے باوجود یہ حقیقت مسلمہ ہی رہے گی کہ جب اللہ تعالیٰ فنائے عالم پر برپا ہونے والی قیامت کبریٰ میں حضرت عیسیٰ سے مذکورہ استفسار کریں گے تو عیسیٰؑ کا جواب یہ ہوگا کہ وہ اپنی قوم پر اس وقت تک گواہ رہے جب تک ان میں رہے، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں وفات دی (فوت کیا) تو اس کے بعد اللہ ہی انکا نگران تھا۔ یعنی انہیں

اپنی وفات کے بعد اپنی قوم کے عقائد کی تبدیلی کے متعلق کچھ خبر نہیں۔ اگر عیسیٰؑ آسمان سے دنیا میں دوبارہ آئیں گے تو انہیں مسیحیوں کے اس شرک کا ضرور علم ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ جو جواب دیں گے وہ یوں ہونا چاہیے کہ دنیا سے قبل از کہولت زندہ اٹھائے جانے کے بعد میرے دنیا میں دوبارہ واپس آنے تک یہ لوگ مشرک ہی چلے آ رہے تھے۔ جب میں دوبارہ دنیا میں گیا تب جا کر مجھے عیسائیوں کے اس شرک کا پتہ چلا تھا، جس کے وہ میرے دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد مرتکب ہوئے تھے۔ چونکہ (قرآن کے مطابق ایسا نہیں ہے) وہ ایسا نہیں کہیں گے لہٰذا حضرت عیسیٰؑ ماضی میں ہی فوت ہوئے اور یہ وفات طبعی تھی۔ جو دنیا میں مدت ختم ہونے پر واقع ہوئی کسی حادثہ سے نہیں، لہٰذا ان کے آسمان پر زندہ اٹھائے جانے اور قیامت کبریٰ سے کچھ پہلے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ صرف ایک بے بنیاد اور بے اصل مفروضہ ہے۔

عیسیٰؑ کا باپ، بھائی اور اولاد: ماضی میں ہی فوت ہونے کی تائید قرآن مجید کی آیت (6/87) سے بھی ہو جاتی ہے، جسمیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن آبائھم وذریتھم واخوانھم ج واجتبینھم وھدینھم الی صراط مستقیم

اور ان کے باپوں، اور انکی اولادوں اور ان کے بھائیوں میں سے بعض کو (ہم نے ہدایت دی) اور ہم نے ان کو چن لیا اور سیدھے راستہ کی طرف چلایا۔''

من آباء ھم وذریتھم واخوانھم میں ضمیر مجرور ''ھم'' کا مرجع ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ھارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط **علیھم السلام** ہیں، جنکا ذکر اسی سورۃ الانعام کی اس آیت سے پہلی آیات 84 تا 86 میں آیا ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ ان تمام انبیاء کے باپ تھے، اولاد تھی اور بھائی تھے، جن میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ بھی ان انبیاء میں

شامل ہیں، لہٰذا اس آیت کے مطابق ان کا باپ بھی تھا، اولاد بھی تھی اور بھائی بھی تھے۔ لہٰذا جہاں یہ غلط ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، وہاں یہ بھی غلط ہے کہ وہ کہولت سے پہلے آسمان پر زندہ اٹھا لئے گئے، اور یہ بھی صحیح نہیں کہ قیامت کبریٰ سے کچھ پہلے دوبارہ دنیا میں آئیں گے، شادی کریں گے اور انکی اولاد بھی ہوگی۔ یعنی فی الحال وہ کنوارے ہیں۔ اس طرح آیت 6/87 و ماقبل آیات کے مطابق ماضی میں ہی انکی اولاد اور بھائی بھی تھے۔ اولاد اور بھائی ہونے سے جہاں عیسیٰؑ کے والد کا ہونا ثابت ہے، خود عیسیٰؑ کی بیوی کا ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عیسیٰؑ کنوارے آسمان پر زندہ نہیں اٹھائے گئے کہ دوبارہ زمین پر واپس آنے کے بعد نکاح کا فریضہ بھی ادا ہو جائے۔ اور قیامت کبریٰ سے کچھ پہلے فوت ہوں تو کنوارے اور بے اولاد فوت نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ موضوع روایات سے لوگوں نے قرآن کے مفہوم کو مضحکہ خیز مجموعہ تضادات بنا ڈالا ہے۔ یہ سب الفاظ کی بازی گری کا سحر ہے جو زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ یہ ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جسمیں پھنسنے والے کے لئے اس سے نکلنا محال معلوم دیتا ہے۔ اس گورکھ دھندے سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کو قرآن سے سمجھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے، تاکہ دنیا اور آخرت میں سرخ روئی اور سرفرازی حاصل ہو۔

قرآن میں انبیاء کے لئے ماضی کا صیغہ: قرآن مجید نے مذکورہ بالا تمام انبیاء کا ذکر ماضی کے صیغہ میں کیا ہے مستقبل کے صیغہ میں نہیں۔ اس واضح حقیقت کے باوجود ڈاکٹر صاحب کا حضرت عیسیٰؑ کا ادھیڑ عمر سے پہلے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور دوبارہ دنیا میں آ کر ادھیڑ عمر کو پہنچنے، شادی کرنے اور بال بچوں والا ہونے کا دعویٰ قرآنی تصریحات سے کامل بے خبری کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ پیدا شدہ منوانے کے لئے اس قسم کی بچوں جیسی باتیں کریں گے کہ:

"یہ ٹھیک ہے، عام ضابطہ تو یہی ہے کہ اولاد ماں اور باپ دونوں سے ہوتی ہے، مگر اللہ کو کسی شئے کی حاجت نہیں، وہ تخلیق میں کسی ضابطے کا پابند نہیں اور نہ ذرائع کا محتاج نہیں، بلکہ وہ جو

چاہے پیدا کرتا ہے۔ وہ تو جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو بس کن کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے"

آیت کا مفہوم: زیرِ نظر آیت **قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر قال کذلک اللہ یخلق ما یشاء ، اذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون** کا مفہوم یہ ہے:

(مریم نے) کہا: اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کیوں کر ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا (دوسرے لفظوں میں حضرت مریمؑ نے کہا کہ لڑکا ہونے کے لئے شوہر کا چھونا ضروری ہے اور میری ابھی شادی نہیں ہوئی تو کیا یہ رکاوٹ دور کر دی جائے گی؟ (اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے) کہا: اللہ تعالیٰ جس (بیٹے) کو بنانا چاہے اسے اسی طرح پیدا کرتا ہے جیسا تیرے بیان سے ظاہر ہے (یعنی مس بشر کی رکاوٹ دور کر کے، جہاں تک اس کے اسباب مہیا کرنے کا تعلق ہے تو) اللہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے: "ہو جا" تب وہ کام (قواعد کے مطابق) ہو جاتا ہے۔

جملہ: "اسی طرح پیدا کرتا ہے، جیسا تیرے بیان سے ظاہر ہے"، **کذلک** کا مفہوم ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے دور خور اعتنا نہیں سمجھا اور اسکی وجہ سے آیت کا صحیح مفہوم ادا نہیں ہوا۔ قوسین میں عبارت توضیحی ہے اور ایجاز حذف پر مبنی ہے۔ یہ صنف سخن قرآن حکیم میں بکثرت استعمال ہوئی ہے اس توضیح کی تائید ماسبق سطور میں پیش کردہ سورہ الانعام کی آیت 87 سے ہوتی ہے جسمیں حضرت عیسیٰؑ کے والد، اولاد اور بھائیوں کا واضح ذکر ہے یعنی وہ بغیر باپ کے پیدا نہیں ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کو اپنے دعوے کو قرآنی بنیاد فراہم کرنے کے لئے چاہئے تھا کہ وہ کم از کم قرآن مجید میں اس موضوع کے بارے میں دوسرے مقامات پر نظر ڈالتے اور باپ کے بغیر پیدائش کے متعلق کوئی استثناء تلاش کرتے اور قارئین اور سامعین کے سامنے پیش کرتے۔ ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو کہتا ہے ضروری نہیں کہ وہ اس کے مطابق کرتا بھی ہو۔ یہ ایک بہت بڑی بھول ہے اور گستاخی بھی۔ ارض و سماوات میں جو کچھ ہو رہا ہے لگے بندھے قواعد کے مطابق ہو رہا ہے، سورج مشرق سے نکلتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے، چاند اور

ستارے اور سیارے رات کو جلوہ گر ہوتے ہیں، دن رات باقاعدگی سے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں، اسی طرح پہلی اور ابتدائی پیدائش کے بعد انسان ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اور پہلی پیدائش کے بعد یہ سلسلہ توالد و تناسل کسی استثناء کے بغیر چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ (49/13)

کیا عیسیٰؑ انسان نہیں تھے؟

اگر انسان تھے تو اس نر و مادہ کے ملاپ سے پیدائش کے قاعدہ سے کس طرح مستثنیٰ سمجھے جا سکتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے ایسے کسی استثناء کا کسی بھی انسان کے لئے ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب وہی باتیں دہرا رہے ہیں جو ملالی حضرات عرصہ دراز سے کرتے چلے آرہے ہیں، اور جو سراسر جاہلانہ، خلاف فطرت، اور خلاف قرآن ہیں۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کے اس شعر کا مصداق بننا پسند نہیں کریں گے:

ع میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

کیا انجیل میں احکام نہیں تھے؟؟

ڈاکٹر صاحب نے آخر میں ایک اور گل کھلایا ہے۔ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ اس کو یعنی حضرت عیسیٰؑ کو کتاب اور حکمت سکھائے گا اور تورات اور انجیل بھی۔ یہاں کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل چار چیزیں ہیں۔ ان کے مابین تین واؤ آئے ہیں۔ ان میں سے دو تو واؤ عطف اور ایک واؤ تفسیری ہے۔ ''اللہ اس کو سکھائے گا کتاب اور حکمت یعنی تورات اور انجیل''۔ درمیانی واؤ یعنی کے معنوں میں ہے۔ یہاں تورات کو کتاب اور انجیل کو حکمت کہا گیا ہے۔ تورات میں صرف احکام تھے حکمت نہ تھی اور انجیل میں صرف حکمت ہے، احکام نہیں۔ اس نکتے کو سمجھ لینے سے ساری گتھی حل ہو جاتی ہے۔ اور اگر اسے نہیں سمجھا تو پھر

ذہنوں میں پریشانی رہتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے ویعلمھم الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل (3/48) کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"اور وہ انہیں لکھنا (پڑھنا) اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔"

لیکن تشریح میں "لکھنا (پڑھنا) کے بجائے "کتاب" لکھ کر مذکورہ بالا گوہر افشانی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تورات اور انجیل دونوں کو ہدایت قرار دیا ہے۔ ہدایت احکام کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس لئے لازماً تورات اور انجیل میں احکام ہیں جیسا کہ آیات کریمہ:

---- وانزل التوراۃ والانجیل[3] من قبل ھدی للناس (3/4)

ترجمہ "اور اللہ نے اس قرآن سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کیں۔"

وقال المسیح یا بنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی وربکم (5/72)

ترجمہ: مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل تم اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔

کیا اعبدوا اللہ حکم نہیں؟؟

آپ کا یہ ارشاد بھی قرآن حکیم میں موجود ہے:

"ولاحلّ لکم بعض الذی حرّم علیکم (3/50)

ترجمہ: اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعض ایسی چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں"۔ کیا یہ بھی صرف حکمت تھا، حکم نہیں؟؟

زیر نظر آیت کا مفہوم یہ ہے: "(اللہ) اسے الہامی کتابیں اور (الہامی) حکمت سکھائے گا اور بالخصوص تورات اور انجیل بھی"۔ یہاں الکتاب سے مراد تمام الہامی کتب ہیں۔ صرف تورات نہیں جس طرح اہل الکتاب سے صرف یہودی مراد نہیں بلکہ عیسائی بھی مراد ہیں۔ ان کے علاوہ وہ تمام اقوام مراد ہیں جو تورات سے پہلے الہامی کتب کے ذریعے ایمان لائیں۔ حضرت ابراہیم

یہودی یا عیسائی نہیں تھے۔ تورات اور انجیل تو ان کے بعد نازل ہوئیں۔'' صحف ابراہیم وموسیٰ کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

پنگھوڑے میں کلام بچپن میں ذہین ہونے کی وجہ سے باتیں کرنے سے کنایہ ہے۔ چنانچہ تفسیر خازن نے ویکلم الناس فی المھد کا مفہوم ویکلم الناس صغیرا لکھا ہے اور تفسیر مدارک التنزیل و حقائق التاویل نے ویکلم الناس طفلا بیان کیا ہے۔ یعنی بچپن میں لوگوں سے باتیں کرے گا۔ ذہین بچے دوسروں کے مقابلہ میں، بچپن میں لوگوں سے اچھی اور بامعنی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ عام ضابطے کے خلاف نہیں۔ اسی طرح کہولت میں لوگوں سے باتیں کرنے کا مطلب رسالت ونبوت کی باتیں کرنا ہے۔ اور اس سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حضرت مسیحؑ ادھیڑ عمر سے پہلے فوت نہیں ہونگے۔ ادھیڑ عمر میں فوت ہونا بھی کوئی معجزہ والی بات نہیں۔ معلوم ہوتا ہے موضوع روایات کے واضعین نے کلام اللہ کو جھٹلانے کے لئے کہ مسیحؑ ادھیڑ عمر میں رسالت ونبوت کی باتیں کریں گے، یعنی اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچائیں گے، ادھیڑ عمر سے پہلے آسمان پر اٹھانے کی روایت گھڑی تھی، جو بے سروپا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی سورہ آل عمران کی آیت 44 کی یہ تشریح درست نہیں ہے کہ حضرت مریم کی کفالت پر قرعہ اندازی کے لئے برتن میں قلمیں ڈالنے کے موقع پر:

''اللہ نے حضرت زکریا کا نام نکال دیا''

کیونکہ حضرت زکریا تو حضرت مریم کے بچپن سے کفیل تھے۔ یہ قرعہ اندازی اس وقت ہوئی تھی جب مریم بالغ ہوئیں اور حضرت زکریا بقید حیات نہیں تھے۔ نیز حضرت یحییٰ صغیر السن تھے۔ قرعہ اندازی کرنے والے بدنیت متولی تھے، انہیں priest سمجھنا بھی درست نہیں، کیونکہ یہ لفظ عموماً عیسائی پادریوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ابھی تو حضرت عیسیٰؑ اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا دوسرا مقالہ۔

ذیل میں سورۃ آل عمران کی آیت 55، ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اس کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ ہو:

اِذ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَھِّرُکَ مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاَحْکُمُ بَیْنَکُمْ فِیْمَا کُنْتُمْ فِیْہِ تَخْتَلِفُوْنَ (55)

''اس وقت اللہ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھالوں گا اور تمہیں کافروں (کی صحبت) سے پاک کردوں گا اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے ان کو کافروں پر قیامت تک فائق (وغالب) رکھوں گا۔ پھر تم سب میرے پاس لوٹ کر آؤ گے تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے اس دن تمہارے مابین ان کا فیصلہ کردوں گا۔''

ڈاکٹر صاحب کی تفسیر: اور یاد کرو جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ! اب میں تمہیں لے جانے والا ہوں۔ یہ **مُتَوَفِّیْکَ** وہ لفظ ہے جس کو قادیانیوں نے اپنے غلط عقیدے کی بنیاد بنایا ہے کہ عیسیٰؑ کی وفات ہو چکی ہے اور آسانی کے ساتھ اُن لوگوں کو دھوکا دے لیتے ہیں جو عربی نہ جاننے کے سبب اس لفظ کی حقیقت نہیں جانتے اور اس سے وفات کا وہ معنی لیتے ہیں جو اردو زبان میں بس موت ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

اصل میں اس لفظ کا مادہ ہے وف ی جس کا معنی ہے پورا کرنا۔ جیسا کہ ہم کہتے ہیں وعدہ وفا کرو۔ اسی مادے سے باب تفعیل میں بنا وَفّٰی یُوَفِّی۔ دیکھئے اسی سورت کی آیت 25 (**وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ** (کسبت) ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اس عمل کا جو اس نے کیا۔ اسی مادے سے باب تفعّل میں **تَوَفّٰی یَتَوَفّٰی** بنا کسی کو پورا پورا لے لینا۔

پس **مُتَوَفِّیْکَ** کا معنی ہوا کہ اللہ نے حضرت مسیح کو پورا پورا لے لیا اُن کے جسم اور جان سمیت۔ جب ہم کہتے ہیں فلاں وفات پا گیا تو یہ استعارۃ ہے، جسم یہیں رہ گیا صرف جان گئی۔ اور یہی لفظ قرآن میں نیند کے لئے آیا ہے۔ (**اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ**

حِیْنَ مَوْتِھَا)اس لئے کہ نیند میں بھی انسان سے خودشعوری نکل جاتی ہے اگر چہ وہ زندہ ہوتا ہے اگر ذرا سی چیونٹی کاٹ لے تو جاگ جائے گا۔ روح کا تعلق خودشعوری کے ساتھ ہے۔ تو نیند میں بھی اللہ روح کو قبض کر لیتا ہے۔ اس کے لئے بھی یہی تَوَفّی کا لفظ ہے۔ جب انسان مرتا ہے تو روح اور جان دونوں چلی گئیں، صرف جسم رہ گیا۔ یہ بھی تَوَفّی ہے۔ سب سے زیادہ مکمل تَوَفّی تو حضرت مسیح ؑ ہی کا ہے کہ انہیں اُن کے جسم، جان اور روح تینوں سمیت زندہ جوں کا توں لے لیا گیا۔ اور یہی عقیدہ ہے مسلمانوں کا۔ جہاں تک لفظ تَوَفّی کا تعلق ہے اس میں قطعاً کوئی پیچیدگی نہیں کہ کوئی شخص اس سے وفات عیسیٰ کے لئے دلیل پکڑ سکے۔ ہاں اس لفظ سے اُن لوگوں کو بہکانا آسان ہے جنہیں عربی زبان میں گرامر سے واقفیت نہیں اور وہ ایک ہی وفات جانتے ہیں، حالانکہ از روئے قرآن وفات تین ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

اور تمہیں پاک کر دوں گا اُن لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ کفر کیا اور جو لوگ بھی تیری پیروی کریں گے انہیں میں قیامت تک اُن کے اوپر رکھوں گا جنہوں نے تمہارے ساتھ کفر کیا یعنی جو تمہارا انکار کر رہے ہیں اور یہ لوگ ہیں یہودی۔ چنانچہ اُس وقت سے لے کر یہودی مسلسل پستے رہے ہیں۔ حضرت مسیح ؑ 30یا33 عیسوی میں اٹھا لئے گئے۔ اور عیسوی میں ہیکل سلیمانی ختم ہوا۔ کم و بیش سوا لاکھ یہودی ایک ہی دن میں ٹائٹس کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ یعنی یہ قتل عام اور ہیکل کی تباہی حضرت مسیح ؑ کے رفع آسمانی کے 40 سال بعد واقع ہوئی۔ اُس وقت سے لے کر یہودیوں کا داخلہ یروشلم میں ممنوع رہا۔

حضرت عزیر کے زمانے میں دوبارہ ٹمپل بنا جو پھر 70 عیسوی میں ختم ہوا اور یہودیوں کو وہاں سے نکال دیا گیا کہ تم فلسطین میں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ کوئی روس چلا گیا، کچھ مصر، کچھ ہندوستان اور کچھ یورپی ممالک میں چلے گئے۔ گویا یہودی پوری دنیا میں پھیل گئے۔ فلسطین حضرت عمر کے ہاتھوں ایک معاہدے کے تحت فتح ہوا۔ اس وقت فلسطین پر عیسائیوں

کا قبضہ تھا۔ اور انہوں نے جب یروشلم حضرت عمرؓ کو Hand over کیا تو یہ شرط لگائی کہ یہودیوں کو یہاں آباد ہونے کی اجازت نہ ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے اس شہر کو Open City قرار دیا اور یہودیوں کو یہاں آنے اور زیارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ البتہ وہ یہاں کوئی پراپرٹی نہیں خرید سکتے تھے، نہ مکان بنا سکتے تھے اور نہ یہاں Settle ہو سکتے تھے۔ یہ صورت حال اُس وقت تک قائم رہی جب تک خلافت قائم رہی۔ ترکوں نے بھی اجازت نہ دی، حالانکہ یہودیوں نے انہیں بڑی بڑی رشوتیں پیش کی تھیں۔ پھر یہودیوں نے ایک سازش کے تحت خلافت کا خاتمہ کرایا، کیونکہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ اس خلافت کے ہوتے ہوئے وہ کبھی فلسطین میں دوبارہ آباد نہیں ہو سکیں گے۔ خلافت ختم ہونے کے بعد 1917ء میں Balford Declaration کے ذریعے یہودیوں کو یہاں آ کر Settle ہونے اور جائیدادیں خریدنے کی اجازت ہو گئی۔ Balford برطانیہ کا وزیر تھا۔ اس کے 31 برس بعد اسرائیل کی ریاست وجود میں آ گئی۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ مٹھی بھر یہودیوں کو دنیا کی پوری معیشت کے بڑے حصے پر کنٹرول حاصل ہے مگر یہ سب کچھ عیسائیوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ہے۔ اگر عیسائی ان کی مدد نہ کریں تو عرب ایک ہی دن میں ان کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیں لیکن اب ان کی پشت پر امریکہ کی حکومت ہے۔ امریکہ اور برطانیہ تو گویا اسرائیل کے زرخرید غلام ہیں۔ کچھ اور عیسائی ممالک کا بھی یہی حال ہے۔ اس وقت انہیں عیسائیوں پر پورا غلبہ حاصل ہے۔ بظاہر تو عیسائی ان کی پشت پر نظر آتے ہیں مگر حقیقتاً سازشی انداز میں یہودیوں کا ان پر پورا کنٹرول ہے۔

پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے اور پھر میں فیصلہ کروں گا ان باتوں میں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو"

ڈاکٹر صاحب نے یٰعِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ کا یہ ترجمہ کر کے کہ اے عیسیٰؑ! میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ توفّی کے معنی پر بحث کی ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ سب سے زیادہ مکمل توفّی تو حضرت عیسیٰؑ کا ہے کہ

انہیں جسم، جان اور روح تینوں سمیت زندہ جوں کا توں لے لیا۔ جبکہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا ترجمہ یہ ہے کہ:

''اے عیسیٰ (کچھ غم نہ کرو) بیشک میں تم کو وفات دینے والا ہوں اور (فی الحال) میں تم کو اپنی طرف اٹھائے لیتا ہوں۔'' اور حاشیہ میں تشریح کی ہے:

''یعنی اپنے وقت موجود پر طبعی موت سے وفات دینے والا ہوں۔ اس سے مقصود بشارت دینا تھا حفاظت من الاعداء کی، یہ وقت موجود اس وقت آوے گا جب قرب قیامت کے زمانہ میں عیسیٰؑ آسمان سے زمین پر تشریف لاویں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں آیا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب مولانا اشرف علی صاحب کی طرح **توفی** کو موخر اور **رفع** کو مقدم نہیں کرتے۔ اشرف علی تھانوی مرحوم **توفی** سے طبعی وفات لیتے ہیں، جو قیامت کبری سے کچھ قبل حضرت عیسیٰؑ کے دوبارہ دنیا میں آنے پر واقع ہوگی۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب **توفی** سے طبعی وفات مراد نہیں لیتے بلکہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو جسم، جان اور روح تینوں سمیت زندہ لے لیا۔ بالفاظ دیگر نیند والی **توفی** مراد لیتے ہیں۔ جو ان کے ترجمہ ''میں تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے تم کو اپنی طرف اٹھالوں گا، کے برعکس ہے۔ کیونکہ دنیا میں مدت پوری کرنا طبعی وفات کے معنے میں لیا جاتا ہے۔ ترجمہ اور تفسیر میں یہ تضاد انکی بوکھلاہٹ ظاہر کرتا ہے۔ تاہم ان کی عمومی سوچ یہی معلوم ہوتی ہے کہ عیسیٰؑ زندہ آسمان کی طرف اٹھالئے گئے۔ لیکن یہ بات بھی غیر فطری اور غلط ہے، جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت 116 سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ جسمیں ماضی میں حضرت عیسیٰ نے کہا تھا ''میں نے (اپنی قوم) سے کچھ نہیں کہا بجز اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اور میں ان پر اس وقت تک گواہ تھا جب تک میں ان میں رہا۔ پھر جب تو نے مجھے فوت کر لیا (تو اس کے بعد) تو ہی ان پر نگران تھا اور تو ہر شئے پر حاضر (و ناظر) ہے''۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کا آخرت میں دیا گیا بیان ہے۔

قرآن مجید میں دو قسم کے **توفی** کا ذکر ہے۔ ایک موت کا دوسرا نیند کا۔ جیسا کہ سورۃ

الزمر کی آیت 42 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اللہ یتوفّی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا ، فیمسک التی قضی علیھا الموت ویرسل الاخری الی اجل مسمّی ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون

(اللہ وہ ہے جو دو طرح روحوں قبض کرتا ہے موت کے وقت اور نیند میں ۔وہ مرنے والوں کی روحوں کو اپنے ہاں روک لیتا ہے لیکن باقی ارواح کو ایک خاص میعاد کے لئے ان کے اجسام میں دوبارہ بھیج دیتا ہے۔اس حقیقت میں اہل فکر کے لئے کچھ اسباق موجود ہیں)

یعنی مرنے پر قبض کی جانے والی روح روک لی جاتی ہے اور نیند کے وقت قبض کی گئی روح جسم میں واپس بھیج دی جاتی ہے۔اور یہ عمل انسان کی زندگی تک اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یقیناً زیر نظر آیت میں موت والا توفّی مراد نہیں ، بلکہ نیند والا توفّی مراد ہے۔اسی طرح بے ہوشی میں بھی روح قبض کر لی جاتی ہے۔لہٰذا اکمل توفّی انسان کی موت کا ہے۔اور ناقص توفّی نیند اور بے ہوشی کا ہے۔

روح انسان کے خاکی جسم میں موجود ایک لطیف جسم ہے اور دراصل حقیقی انسان ہے۔ موت پر یہ لطیف جسم خاکی جسم کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔خاکی جسم اسکی عارضی قیام گاہ ہونے کے علاوہ اس کا تابع ہے اور اس کے اعضاء اس کے اوزار ہیں ۔اصل انسان آنکھ سے دیکھتا ہے کان سے سنتا ہے، ناک سے سونگھتا ہے، دماغ سے سوچتا ہے۔وغیرہ وغیرہ خاکی جسم اصل انسان کو اس کثیف مادی دنیا کے لئے دیا گیا ہے۔آخرت میں اس خاکی جسم کی ضرورت نہیں ۔لہٰذا یہ موت پر لاش بن جاتا ہے، جسے ٹھکانے لگانے کے مختلف طریقے ہیں ۔زیادہ مشہور دفن کرنا اور جلا کر راکھ کرنا ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود (OmniPresent) ہے۔وہ انسان سے اسکی شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔لھذا رافعک اِلَیّ سے رافعک الی السماء مراد لینا درست نہیں ہوگا۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ نے سورہ مائدہ کی آیات 116 تا 117 کے مطابق اپنے وقت پر طبعی وفات پائی

تھی۔ اور طبعی سے پہلے توفّی اور رفع کا مفہوم وہ نہیں جو ڈاکٹر صاحب اور مفسرین اور مترجمین نے عام طور پر لیا ہے۔ ان کا تعلق ایک تاریخی واقعہ سے ہے، جس کا ذکر اناجیل اربعہ میں بھی موجود ہے۔

آل عمران آیات 52 تا 54: ڈاکٹر صاحب نے سورۃ آل عمران کی آیت 55 سے پہلے آیات 52 تا 54 کو ترجمہ اور تفسیر کے بغیر چھوڑ دیا ہے۔ جو قابل غور ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو **انی متوفیک و رافعک الی** کیوں کہا تھا۔

آیات 54-52/3 یوں ہیں: **فلما احس عیسیٰ منھم الکفر قال من انصاری الی اللہ قال الحواریون نحن انصار اللہ آمنا باللہ واشھد بانا مسلمون . ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فا کتبنا مع الشاھدین ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الما کرین** (پس جب عیسیٰ ؑ نے ان سے کفر کو محسوس کیا (اور دیکھا کہ یہ مجھے مار کر چھوڑ جائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ مجھے بچالے گا) تو انہوں نے کہا کہ اللہ کی طرف (مجھے اٹھا کر لے جانے میں) کون میرا مددگار ہوگا۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ (کے حکم کو پورا کرنے میں) مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور (اے عیسیٰ) تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں (پھر انہوں نے اللہ سے مخاطب ہو کر کہا) اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے پہلے اتارا ہم نے اسے مانا اور ہم اس پیغام لانے والے کے بھی تابع ہیں، سو تو ہمیں گواہوں کے ساتھ لکھ لے۔ اور ان (کافر۔ یہودیوں) نے خفیہ تجویز کی (یعنی قیصر کے پاس گئے اور بغاوت کا الزام لگا کر مسیح ؑ کے لئے (صلیب کا حکم لے آئے) اور اللہ نے بھی خفیہ تجویز کی (یعنی اس صوبہ کے گورنر کے دل کو مسیح ؑ کو بچانے کی طرف مائل کر لیا) اور اللہ تمام خفیہ تجویزیں کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے۔ (یہ کافر تمہیں صلیب پر لٹکوانے میں کامیاب ہو جائیں گے مگر تم صلیب پر مرو گے نہیں بلکہ بے ہوش ہو جاؤ گے)

اذقال اللہ یعیسیٰ انی متوفیک و رافعک الی ومطھرک من الذین کفروا وجاعل الذین اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم القیامۃ ، ثم الی مرجعکم

فاحکم بینکم فیما کنتم فیه تختلفون (3/55) ترجمہ (یہ اس وقت کا ذکر ہے) جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ" میں صلیب پر تمہاری حالتِ مردے جیسی بنا دوں گا اور تمہیں اپنی طرف (ایسی جگہ) اٹھوا منگواؤں گا (جہاں تم ان کافر یہودیوں کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے اور پھر اپنا مشن مکمل کرو گے) اور تمہیں ان کافروں سے پاک کر دوں گا اور تمہارے متبعین کو ان یہود کے کافروں پر پیشی کے دن تک غلبہ دوں گا، پھر تمہارا میری طرف رجوع ہو گا۔ پیشی کے دن تمہارے درمیان ایسی باتوں میں فیصلہ کیا کرتا ہوں جسمیں تم (دنیا میں) اختلاف کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ صلیب پر بے ہوش ہو گئے تھے۔ بے ہوشی سے ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ دیکھنے والوں نے سمجھا وہ مر گئے بہر حال عیسیٰ" کے شاگرد مناسب موقع پر انہیں صلیب سے اتار کر اور کندھوں پر اٹھا کر کسی محفوظ جگہ لے گئے، جہاں وہ صحت یاب ہوئے، اور وہاں سے ہجرت کر گئے، پھر تیاری کر کے انہوں نے اپنے متبعین کے ذریعے کافر یہودیوں کو سزا دی اور ان پر غلبہ حاصل کیا۔ جیسا کہ سورۃ صف کی آیت 14 سے واضح ہے:

یا ایھاالذین آمنو کونوا انصار اللہ کما قال عیسی بن مریم للحوارین من انصاری الی اللہ ۔قال الحواریون نحن انصار اللہ . فامنت طائفة من بنی اسرائیل و کفرت طائفة ۔ فایدنا الذین آمنو اعلی عدوھم فا صبحو ا ظاھرین (اے ایمان والو! اللہ کے (قرآن کے) مددگار بن جاؤ، جس طرح عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ اللہ کی طرف (اٹھا کر لے جانے میں) میرا کون مددگار ہو گا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے (حکم میں) مددگار ہیں۔ (اس عاجزانہ ہجرت کے بعد مسیح" کافر یہودیوں کو سزا دینے کے لئے واپس آئے) چنانچہ بنی اسرائیل کا ایک طائفہ ایمان لایا اور ایک طائفہ (اسی طرح) کفر پر اڑا رہا (اور دشمنی سے باز نہ آیا) ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ان کے اپنے دشمنوں پر مدد دی، لہٰذا وہ غالب ہو گئے۔

عیسائی عیسیٰؑ کے متبع نہیں: سورہ مائدہ کی آیات 116، 117 سے پتہ چلتا ہے کہ

حضرت عیسیٰؑ کی طبعی وفات کے بعد عیسائیوں میں شرک سرایت کر گیا تھا اور انہوں نے عیسیٰؑ اور انکی والدہ کو معبود کا درجہ دیدیا تھا۔ اوپر سورہ صف کی آیت 14 سے واضح ہوتا ہے کہ کافر یہودیوں پر عیسیٰؑ کے متبعین کا غلبہ عیسیٰؑ کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا۔ اور یہ غلبہ متبعین کی موت تک جاری رہا۔ اب عیسائی تثلیث پرست ہیں، انہیں عیسیٰؑ کا متبع سمجھنا غلط ہے۔

رَافِعُکَ اِلَیَّ کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ دو مثالیں کافی ہیں۔ سورہ العنکبوت کی آیت 26 میں ہے **وقال انی مھاجر الی ربی** میں ہجرت کر کے اپنے پروردگار کے پاس چلا جاؤں گا کا مفہوم تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل نے یہ بیان کیا ہے۔ **وقال ابراھیم انی مھاجر من کوثی وھی من سواد الکوفۃ الی حرآن ثم منھا الی فلسطین وھی من بریۃ الشام (الی ربی) الی حیث امرانی ربی الھجرۃ الیہ** : (ابراہیم) نے کہا میں کوثی سے جو کوفہ کے نواح میں ہے (ہجرت کر کے) حران پھر وہاں سے فلسطین، جو شام کا کھلا علاقہ ہے اپنے پروردگار کی طرف چلا جاؤں گا یعنی اس جگہ چلا جاؤں گا جہاں ہجرت کر کے جانے کا مجھے میرے پروردگار نے حکم دیا ہے)

تفسیر خازن نے اس کا یہ مفہوم دیا ہے: **(وقال) ابراھیم (انی مھاجر الی ربی) الی حیث امرنی ربی فھاجر من کوثی وھی من سوادالکوفۃ الی حرّان ثم ھاجر الی الشام** . (ابراہیم) نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کر جاؤں گا (یعنی اس جگہ چلا جاؤں گا جہاں جانیکا میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے۔ چنانچہ وہ کوثی سے ہجرت کر کے جو کوفہ کے نواح میں ہے حران پہنچے پھر وہاں سے شام چلے گئے)

تفسیر مدارک نے **وقال انی ذاھب الی ربی** کا مفہوم **الی موضع امرنی بالذھاب الیہ** دیا ہے۔ یعنی میں اپنے رب کی طرف چلا جاؤں گا، کا معنی ہے کہ ایسی جگہ جاؤں گا جہاں اس نے مجھے جانے کا حکم دیا ہے۔

"ہذا رافعک الیّ" کا مفہوم یہ ہے کہ میں تمہیں حواریوں کے ذریعے ایسی جگہ اٹھوا منگواؤں گا جہاں تم کافر یہودیوں کے شر سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ اس قسم کے انداز بیان کو علم البیان میں مجاز عقلی کہتے ہیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ مثال کافی ہوگی:

بَنَی عمرو بن العاص مدینة الفسطاط (عمرو بن العاص نے شہر فسطاط تعمیر کیا۔)

عمرو بن العاص اسلامی لشکر کے سپہ سالار تھے، شہر تعمیر کرنا انکا کام نہیں تھا شہر تو ان کے مقرر کردہ کاریگروں اور مزدوروں نے تعمیر کیا تھا۔ "ہذا فسطاط کی تعمیر انکی طرف نسبت مجازی ہے اور اس فقرے کا معنی یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے فسطاط کا شہر تعمیر کروایا۔

حضرت عیسیٰ صلیب پر بے ہوش ہو گئے جسکی وجہ سے انکی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی دیکھنے والوں نے سمجھا وہ مر گئے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو اس واقعہ کی پہلے سے اطلاع دیدی تھی۔ جسکی بنا پر حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو اعتماد میں لے کر انہیں بتا دیا تھا کہ وہ رات کو حاکم سے اجازت لے کر انہیں صلیب سے اتار کر اپنے کندھوں پر کسی محفوظ جگہ لے جائیں گے (اور حواریوں نے ایسا ہی کیا)۔ اس کاروائی کو اللہ تعالیٰ نے ورافعک الیّ کے الفاظ میں بیان فرمایا۔ اس پیشگی اطلاع کا ثبوت سورۃ النساء کی ان آیات سے ملتا ہے۔ جہاں ارشاد الٰہی ہے:

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله ۚ وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم ۚ وان الذين اختلفوا فيه لفي شك منه ۚ ما لهم به من علم الا اتباع الظن وما قتلوه يقينا ۝ بل رفعه الله اليه ۚ وكان الله عزيزا حكيما ۝ وان من اهل الكتاب الا ليومنن به قبل موته ويوم القيامة يكون عليهم شهيدا ۝ (157-159)

ترجمہ: اور انکے اس کہنے کے سبب کہ بلاشبہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم، اللہ کے رسول کو قتل کر دیا ہے، حالانکہ انہوں نے اُسے قتل نہیں کیا اور نہ صلیب پر مار سکے، لیکن وہ (صلیب پر بے ہوش ہو جانے کے سبب) انکے لئے مصلوب جیسا بنایا گیا۔ اور بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے اس کے بارے اختلاف کیا ہے اس سے شک میں ہیں۔ انہیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، صرف ظن کی پیروی

اورانہوں نے اسکو قتل تو یقیناً نہیں کیا، بلکہ (مسیح ؑ کے صلیب پر بے ہوش ہو جانے پر جیسا کہ طے ہوا تھا) اللہ (حواریوں کے ذریعے) اُسے اپنی (بتائی ہوئی محفوظ جگہ کی) طرف اٹھوا لے گیا اور اللہ (ہمیشہ سے اپنے امر پر) غالب (اور ساتھ ہی) حکمت کے ساتھ کام کرنے والا (رہا) ہے۔ اور ان اہل کتاب میں سے (جنہوں نے رسول کریم ؐ کے مقابلہ پر دیدہ ودانستہ جھوٹ بول کر کہا تھا انا قتلنا المسیح) کوئی نہیں ہے مگر وہ (اپنے قول کے برخلاف) اس (امر یعنی مسیح ؑ کے عدم قتل) پر اپنی موت سے پہلے (یعنی اس دنیا کی زندگی ہی میں) ضرور ایمان لائے گا اور قیامت کے دن وہ (یعنی خود اللہ تعالیٰ) ان (جیسے لوگوں) پر گواہی دینے والا ہوتا ہے۔

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ میں مشبہ بہ محذوف ہے اور وہ بالمصلوب ہے۔ یعنی یہ آیت ولٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ (بالمصلوب) ہے۔ جس جگہ کفر وشرک پر مجبور کیا جاتا ہو یا وہاں بے حیائی کے محرکات بکثرت ہوں یا وہاں انسان کسی مرض، تنگی، مصیبت یا جہالت میں گرفتار ہو، تو اگر ایسا انسان وہاں سے ان چیزوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں اللہ اس کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور ایسے ظلموں سے چھڑا دے تو ایسے علاقہ کی طرف ہجرت کرنا اللہ کی طرف جانا ہے۔ صلیب پر بندھے ہوئے حضرت عیسیٰ ؑ بے ہوشی کے عالم میں تھے اور اپنے پاؤں پر چل کر کہیں نہیں جا سکتے تھے، ایسی صورت میں اللہ انہیں حواریوں کے ذریعے اٹھوا کر کسی ایسی جگہ لے گیا جہاں انہیں صحت عطا کی گئی اور ظالموں کے جبر سے خلاصی ملی، یہی ان کا خدا کی طرف اٹھا کر لے جانا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ مسیح ؑ کو جسم، جان اور روح سمیت آسمان کی طرف یا آسمان پر لے گیا، جنوں اور پریوں کے قصوں کو منوانا ہے۔ قرآن مجید قصہ طوطا مینا، طلسم ہوشربا یا الف لیلہ ولیلہ قسم کی کتاب نہیں۔ یہ خالق ارض وسما کی تصنیف ہے۔ اس میں علم وحکمت کی باتیں ہیں۔ اور یہ ھدی للمتقین ہے۔ وان ھدی اللہ ھو الھدی۔ اسی وجہ سے ملالی کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اسکے معنے بدلنے کے لئے اسمیں وضعی روایات کی آمیزش کرنے پر مجبور ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2۔ جاوید احمد غامدی صاحب کی قرآن فہمی۔

موقر ماہنامہ ''بیدار ڈائجسٹ'' کے جولائی 2004 کے شمارہ میں جناب جاوید احمد غامدی کا ایک خطاب ''**پرویز صاحب کا فہم قرآن**'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، جس کی تلخیص وترتیب کے فرائض جناب شکیل عثمانی صاحب نے سرانجام دیئے ہیں۔

جہاں تک خاکسار کو یاد پڑتا ہے، جناب غامدی صاحب نے قرآن مجید کی آیاتِ وراثت پر اپنی تحقیق پیش کی تھی جو پہلے عربی میں ایک کتابچہ کی شکل میں اور بعد ازاں ماہنامہ اشراق میں کئی مقالات کی صورت میں اردو میں شائع ہوئی، جس میں انہوں نے سورہ بقرہ، (آیات 182-180) میں مومنین کو مرنے سے پہلے والدین اور اقرباء کے لئے وصیت کر جانے کے حکم کو، سورۃ نساء میں والدین اور اقرباء کے حصے متعین ہونے پر **منسوخ** قرار دیا اور بتایا کہ مرنے والے کے بھائی بہن اس (بے اولاد مرنے والے) کے اور ان کے مشترکہ والدین کے ساتھ وارث ہوں گے اور یہ کہ کلالہ کسی شخص کے ان رشتہ داروں کو کہا جاتا ہے جن کا تعلق اس سے اولاد اور والد کا نہ ہو، مگر بعد میں ایسی قرابت کے معنی میں لینے کو ترجیح دی جو اولاد اور والد کی طرف سے نہ ہو۔

خاکسار کی طرف سے غامدی صاحب کی تحقیق کے ناقدانہ جائزہ میں انکی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی، جو علمی، فکری، تحقیقی مجلہ سہ ماہی ''آواز'' کے شمارہ نمبر 8 (جولائی تا ستمبر 1999) میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ چونکہ غامدی صاحب کے خطاب کے تنقیدی جائزہ سے متعلق ہے، لہٰذا غامدی صاحب کی مذکورہ بالا غلطیوں کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا گیا ہے۔

غامدی صاحب نے اپنے خطاب کی **تعریض آمیز تمہید میں پرویز مرحوم کے اصول فہم اور قرآن مجید کی زبان تک رسائی کے لئے ان کے طریقہ پر گفتگو کے ضمن میں دو مثالیں پیش**

کرنے کے علاوہ ہر زبان میں تشبیہ، استعارہ، تمثیل، مجاز اور عرف وغیرہ کا ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن مجید کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو ان دو مثالوں، اصناف سخن اور عرف کی مثالوں سے واضح ہے۔ انکی **پہلی مثال** اردو میں کثیر الاستعمال لفظ **''شوربا''** سے متعلق ہے جس کا معنی ہر کوئی سمجھتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی ماہر لسانیات یہ بتائے کہ 'شور' نمک اور 'با'' پانی' کو کہتے ہیں۔ لہٰذا ''میں نے شوربے سے روٹی کھائی'' کا معنی ہے، ''میں نے نمکین پانی سے روٹی کھائی۔'' غامدی صاحب کی مراد یہ ہے کہ پرویز صاحب کی لسانی تحقیق اسی قسم کی ہے۔ **دوسری مثال** یہ ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ: ''میں نے ایک ٹیلیویژن خریدا۔'' اگر کوئی اس کی لسانی تحقیق کر کے بتائے کہ لغت کے مطابق 'ٹیلی' کا مطلب 'انتقال' اور 'وژن' کا معنی 'منظر' ہے۔ اسلئے اس شخص نے گویا کہا کہ: ''اس نے ایک ''انتقال منظر'' خریدا۔ یہ بھی اشارہ کنایہ میں، پرویز مرحوم کی لسانی تحقیق پر چوٹ ہے۔ اگر واقعی 'با' کا معنی پانی اور 'شور' کا معنی نمک ہے تو محقق یہ دیکھے گا ان دو چیزوں کے علاوہ شوربا میں اور کیا کیا چیزیں ڈال کر پکایا جاتا ہے، تو وہ شوربا کا معنی ''پتلا سالن'' کرے گا۔ اسی طرح اگر محقق 'ٹیلی' کا معنی لغات میں 'انتقال' کے بجائے 'دور'' پائے گا تو وہ ٹیلیویژن کا مفہوم 'انتقال منظر' کے بجائے دور کا منظر دکھانے والا آلہ بیان کرے گا یا مختصراً ''دور نما''۔ بھارت کے محققین نے ٹیلیویژن کا نام ''دوردرشن'' اور عربوں نے ''**الاذاعة المرئية**'' تجویز کیا ہوا ہے۔

ان دو مثالوں اور تشبیہ، استعارہ، تمثیل، مجاز اور عرف وغیرہ میں بھی غامدی صاحب نے پرویز صاحب کی علمی استعداد پر تعریض سے کام لیکر انکی تحقیر اور اپنی برتری ثابت کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔

پرویز مرحوم ایک دلنشین **اسلوب نگارش** کے مالک تھے۔ انہیں مافی الضمیر کو ادبی اور علمی طریقہ سے بیان کرنے کا ملکہ حاصل تھا اور وہ ایک **معروف دانشور** تھے۔ لہٰذا تشبیہ، تمثیل، استعارہ، مجاز اور عرف وغیرہ کے مقام سے بخوبی آگاہ تھے۔ تاہم جس طرح غامدی صاحب نے

وارثت کی آیات کو سمجھنے میں کئی سنگین غلطیاں کیں اور **وصیت کے قرآنی حکم تک کو منسوخ قرار دیدیا** جو انکی **کج فہمی کا زبردست ثبوت** ہے۔ پرویز صاحب سے اگر ایسی جسارت ہوئی ہے تو اسے ہرگز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ غلطیاں کرنا بشری تقاضا ہے۔

آیئے اب دیکھیں اپنے خطاب میں غامدی صاحب نے پرویز مرحوم کے فہم قرآن میں جو غلطیاں نکالی ہیں، انکی کیا حقیقت ہے۔ غامدی صاحب رقم طراز ہیں:

''مفہوم القرآن'' میں ایک جگہ جناب غلام احمد پرویز نے سورہ نمل کے ان مقامات کی تشریح کی ہے۔ جن میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کے واقعات زیر بحث ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ان مقامات کے انتخاب کا سبب یہ نہیں کہ پرویز صاحب کے ہاں یہی چند مثالیں ہیں، جہاں انہوں نے اپنا مخصوص انداز تحقیق استعمال کیا ہے۔ اس انتخاب کا سبب یہ ہے کہ یہ مقامات تفہیم مدعا کے لئے سہل ہیں، ورنہ صورت حال یہ ہے کہ ''مفہوم القرآن'' کی تینوں جلدیں اگر ابتداء سے پڑھنی شروع کر دی جائیں تو ان میں سے ہر صفحہ اس کی مثال ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ اس وضاحت کے بعد اب آیئے سورہ نمل کی طرف جہاں حضرت سلیمانؑ کے لشکر کی روانگی کا ذکر ہے۔

قرآن اس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ○ (النمل، 17)

یعنی حضرت سلیمانؑ کے لئے سارا لشکر اکٹھا کیا گیا جس میں جن بھی تھے، انسان بھی تھے اور پرندے بھی تھے۔ اب اس آیت میں استعمال ہونے والا لفظ ''جن'' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ یہ اردو زبان کا بھی معروف لفظ ہے، اسی طرح لفظ ''انس'' عربی کا معروف لفظ ہے جو اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ انس و جان کے علاوہ ''طیر'' بھی اردو میں استعمال ہوتا ہے اور عربی میں بھی۔ پرویز صاحب کے لئے یہ تسلیم کرنا تو آسان تھا کہ ''انس'' کا مطلب آدمی ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا میں آدمی تو بہر حال پائے جاتے ہیں لیکن یہ بات کہ جن اور پرندے بھی حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں شامل تھے، ان کے لیے ماننا آسان نہیں

تھا اس مسئلے کا حل انہوں نے دریافت کیا کہ "جن" اور "طیر" دونوں کو اس طرح تختہ مشق بنایا جیسے ہم نے گزشتہ صفحات میں شوربے کی مثال پیش کی ہے۔

"جن" عربی کا معروف لفظ ہے۔ اگر کوئی آدمی اس پر تحقیق کرے تو کہے گا کہ جنوں کو جن اس لیے کہتے ہیں کہ عربی میں جن، جنا اور جنون کے معنی ہیں "چھپا ہوا" یہ چونکہ نظر نہیں آتے اس وجہ سے ان کو جن کہا جاتا ہے۔ ایک دوسرا محقق داد تحقیق دیتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ جنہ کے معنی ہوتے ہیں "چھپا ہوا" لہذا چھپی ہوئی مخلوق سے مراد صحرا کے باشندے بھی ہو سکتے ہیں۔" (لغات القرآن جلد اول صفحہ ۴۴)

"پرویز صاحب چونکہ "جن" کو "انس" کی طرح آگ سے کوئی مخلوق ماننے پر آمادہ نہیں، اس لیے انہوں نے لغت کو سامنے رکھتے ہوئے جنوں کو صحرا کے باشندے بنا دیا۔"

غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ "جن" عربی زبان کا ایک معروف لفظ ہے، مگر وضاحت نہیں فرمائی کہ اس معروف لفظ 'جن' کی لغات میں کیا تعریف بیان کی گئی ہے۔ "المنجد" عربی کی مشہور اور متداول لغت کی کتاب ہے۔ اس میں 'جن' کی مندرجہ ذیل تعریف بتائی گئی ہے:

الجن و الجنة الواحد جنی و الواحدة جنية: مخلوق مزعوم بين الانس و الارواح سمّی بذلک لا ستتارہ و اختفائہ عن الا بصار:

"انسانوں اور فرشتوں کے مابین ایک مبینہ مخلوق جسکی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جن آنکھوں سے پوشیدہ اور مخفی رہتے ہیں۔"

بالفاظ دیگر 'جن' انسانوں اور فرشتوں کے درمیان وہ مخلوق ہے جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ دکھائی نہیں دیتی، پوشیدہ رہتی ہے۔ یعنی ایک غیر مرئی مخلوق ہے۔ جنّ اور جنـہ جمع کے لفظ ہیں۔ ایک مذکر کو جنـیّ اور مونث کو جنّیة کہا جاتا ہے۔ یعنی جنّ: دیو، بھوت اور جنّیة: جننی بھوتنی، بھتنی یا چڑیل کے معنی میں ہے۔ پری کو بھی عربی زبان میں جنّیة ہی کہتے ہیں۔ لہذا جنّ اور جنّیة دیو، بھوت پریت چڑیلیں اور پریاں ہیں۔ ان کا ذکر الف لیلة

ولیلۃ، طلسم ہوش ربا، قسم کی کہانیوں کی کتابوں میں ملتا ہے۔ جیسے ایک یتیم لڑکے کو ایک چراغ ملا جسے رگڑنے سے ایک جن نمودار ہو کر کہتا تھا: ''کیا حکم ہے میرے آقا''۔ اس لڑکے کا نام الہ دین تھا۔ وہ کہانی میں جن سے انواع اقسام کے کھانے منگوایا کرتا اور اپنی بہت سی ضرورتیں پلک بھر میں اس سے پوری کروالیا کرتا تھا۔ پھر جب وہ ملک کی شہزادی کے عشق میں مبتلا ہوا تو جن کے ذریعے اس شہزادی کو اسکے محل سمیت اٹھوا منگوایا۔ ایک مچھیرے کو ایک بوتل ہاتھ لگی جس میں کسی نے ایک جن بند کر رکھا تھا۔

ہمارے مذہبی بزرگ بھی ایسی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک نئے شادی شدہ جوڑے میں شوہر اپنی بیوی کا اتنا عاشق تھا کہ ہر وقت اس کو نگاہوں کے سامنے رکھتا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اسکی بیوی رفع حاجت کے لئے بیت الخلا میں گئی تو وہ باہر کھڑا ہو گیا اور اسکی طرف سے برآمد ہونے میں تاخیر ہوئی تو اُسے چھوچھو جن سے ڈرانے لگا۔ کہ اگر وہ باہر نہ آئی تو چھوچھو جن اُسے اٹھا لے جائے گا۔ لیکن شوہر صاحب کی دھمکی کا بھی جب کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو انہوں نے اندر جھانکا، زوجہ محترمہ غائب تھیں۔ شوہر صاحب بہت پریشان ہوئے اور ایک مانے ہوئے عالم دین بزرگ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی بپتا سنائی۔ بزرگ نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ کل علی الصبح شہر کے فلاں دروازہ پر جائے اور اپنے ساتھ ایک روٹی لے جائے، جہاں اسے ایک کتا مسلسل گھور کر دیکھے گا۔ وہ روٹی اس کے آگے ڈال دے، کتا روٹی اٹھا کر چل پڑے گا، وہ جہاں جہاں جائے اس کے تعاقب میں رہے۔ کتا زمین میں ایک سوراخ میں گھس جائے گا، وہ اس کے پیچھے سوراخ میں گھس جائے۔ یہ ایک سرنگ ہوگی اس کے اختتام پر شاہ جنات کا دربار ہوگا باہر ایک جن پہرہ پر کھڑا ہوگا۔ شوہر اس سے شاہ جنات سے ملنے کی درخواست کرے گا تو وہ اجازت لیکر اسے اندر جانے دے گا۔ شاہ جنات بڑا رحم دل اور انصاف پرور واقع ہوا ہے، وہ اس کی داستان الم سنکر چھو چھو جن سے اسکی بیوی واپس دلوا دے گا۔ چنانچہ اس طرح شوہر صاحب کو اپنی گمشدہ بیوی مل گئی۔

ہمارے کئی مولوی، پیر اور روحانی عامل جنوں پر قابض ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ اخبارات

میں آئے دن ایسی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن کے مطابق ایسے لوگوں نے کئی عورتوں کے "جن" نکالنے کے بہانے سے انکے گھر والوں کی باہر موجودگی میں، ایک کمرے میں بند ہو کر انکی آبرو ریزی کی یا انہیں مار مار کر دوسرے جہاں پہنچا دیا۔ غامدی صاحب کی 'عرف' کے دفاع کے پیچھے ایسے ہی جن ہیں یا وہ کوئی اور جن مراد لیتے ہیں؟؟ **اگر ان کے معروف جن یہ نہیں تو انکی صحیح تعریف کس لغت کی کتاب میں مل سکتی ہے؟؟**

المنجد کی دی گئی تعریف کے مطابق جن نظر نہ آنے والی ایک خیالی مخلوق ہے۔

کیا قرآن حکیم میں ایسے ہی دیو، بھوت پریتوں کا ذکر ہے؟ کیا سلیمانؑ کے لشکر میں بھی اسی قسم کے دیو بھوت تھے۔؟ **جب جن ایک نظر نہ آنے والی خیالی مخلوق ہے تو سلیمانؑ نے انہیں کیسے قابو کیا**، لشکر میں بھرتی کر کے انہیں کیسے حربی فنون کی ٹریننگ دلوائی اور وہ انسانوں کے شانہ بشانہ صف آراء ہونے لگے۔ اگر جن غیر مرئی مخلوق ہیں تو کیا ان کا اسلحہ بھی غیر مرئی تھا۔ اگر انہیں مادی اسلحہ کی ضرورت نہیں تھی، تو وہ سلیمانؑ کے دشمنوں کے ساتھ کس طرح لڑتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں **یہ کہیں ذکر نہیں کیا کہ سلیمانؑ کو غیر مرئی چیزیں بھی نظر آجاتی تھیں**۔ افسوس ہے غامدی صاحب نے پرویز مرحوم پر الزام لگاتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کے پاس ایسے جنوں کے دفاع کے لئے کوئی دلیل بھی ہے یا نہیں۔ کیا **غامدی صاحب نے ایسا کوئی جن آج تک دیکھا ہے۔؟؟**

تمام انبیاء اور رسل بشر تھے اور ان کا پیغام بشروں کے لئے ہی تھا۔ اگر جن بشر (انسان) نہیں تو ان کے لئے انبیاء اور رسل بھی معروف جن ہوئے چاہئیں، تا کہ اللہ تعالیٰ کے درج ذیل ارشاد کی مخالفت نہ ہو۔

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ○ (بنی اسرائیل، 95) کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے کہ (اس میں) چلتے پھرتے اور آرام کرتے (یعنی بستے) تو ہم اُن کے پاس آسمان

سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔"

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ جیسی مخلوق ہوگی اسکی طرف رسول (نبی) بھی اسی مخلوق سے ہوگا۔ اور قرآن مجید میں واضح طور پر ذکر ہے کہ کچھ جنوں نے قرآن سنا اور ایمان لائے اور اپنی قوم میں واپس آ کر اسکی تبلیغ کی۔ ان کے یہ کہنے سے کہ:

قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ (احقاف۔30)

(اے بھائیو ہم ایک کتاب سنکر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے)

ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ یہودی کاہن تھے۔ ان کا ذکر:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ..... (احقاف،29)

(اور جب کہ ہم جنات کی ایک جماعت کو آپکی طرف لے آئے جو قرآن سننے لگے تھے)

(ترجمہ اشرف علی تھانوی)

عام یہودی تبلیغ کا کام نہیں کیا کرتے، لامحالہ یہ یہود کے کاہن تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ کہا ہے۔ اگر یہ انسان نہ ہوتے تو نہ حضرت موسیٰ کے پیرو ہوتے اور نہ اپنی قوم کو رسول اللہ کا کہا ماننے اور ان پر ایمان لانے کی دعوت دیتے۔

قرآن مجید میں انسان کی پیدائش کبھی خشک مٹی سے، کبھی پانی سے اور کبھی مٹی اور پانی کے ملاپ یعنی گارے سے بیان کی گئی ہے۔ سورہ الحجر میں ارشاد ربانی ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ (15/26) اور بالتحقیق ہم نے انسان کو بجنے والی مٹی سے جو بدبودار کیچڑ سے بنتی ہے پیدا کیا۔"

تالابوں میں یہ مٹی بدبودار کیچڑ بن جاتی ہے اور پانی سوکھنے پر کناروں پر جم جاتی ہے اور لو کی گرمی سے کھڑکنے والی بن جاتی ہے جن لوگوں میں یہ ناری حصہ زیادہ ہوتا ہے وہ

''جان'' کہلاتے ہیں۔ انکے متعلق فرمایا وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ○ (15/27) اور جنوں کو ہم نے لُو کی (تپش، حرارت) سے پہلے سے ہی پیدا کیا ہے۔ المنجد نے اَلصَّلْصَال کا معنی الطین الیابس الذی یصلّ من یُبْسه ای یصوّت لکھا ہے جس کا ترجمہ ہے: خشک مٹی جو خشک ہونے پر بجنے لگے۔ یعنی کھنکھنانے (بجنے) والی خشک مٹی۔ مٹی لو کی گرمی (تپش، حرارت) سے کھنکھنانے والی بن جاتی ہے۔ جنوں کی تخلیق میں لو (نار السموم) کا حصہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔

زمین میں انسان کو خلیفہ بنایا گیا ہے (38/71، 15/28) سورہ الرحمٰن میں زمین کی نعمتیں جن وانس کے لئے یکساں بتائی گئی ہیں اور میوے، کھجوریں، اناج، ریحان بھی اسی طرح دونوں کے لئے مذکور ہیں، (55/10-13) موتی، مرجان اور کشتیاں بھی دونوں کے لئے یکساں نعمت ٹھہرائی گئی ہیں۔ (55/23-24) یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جن وانس دونوں اوپر آسمان اور زمین کے نیچے مرکز کی طرف نہیں جا سکتے اگر جائیں گے تو دونوں پر آگ اور دھواں بھیجا جائے گا۔ (55/32-34) جہنم کے عذاب بھی دونوں کے لئے یکساں بیان کئے گئے ہیں، (7/179) اسلئے جن وانس دونوں خاکی ہیں اور نوع انسان میں داخل ہیں۔

کیا غامدی صاحب بتا سکتے ہیں پاکستان کے کن کھیتوں اور باغوں کو کاشت کرنے والے انسان ہیں اور کن کھیتوں اور باغوں کو کاشت کرنے والے جن ہیں۔ زمین پر جو انسان بوتے ہیں وہی کاٹتے ہیں۔ جنوں کے کھیت اور باغ دنیا کے کس حصہ میں ہیں؟؟ یہاں جنوں سے مراد غامدی صاحب کے بتائے ہوئے معروف جن ہیں جو نظر نہیں آتے اور لغات میں جنہیں مرعوم کہا گیا ہے۔

حضرت سلیمان کے دربار میں جن وانس اکٹھے بیٹھتے تھے۔ ایک معاملہ میں ایک عالم انسان جن پر بازی لے گیا۔ جن سلیمانؑ کے لئے بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن (ایسے بڑے) جیسے حوض اور بڑی بڑی دیگیں، جو ایک ہی جگہ جمی رہیں بناتے تھے جو وہ بنوانا چاہتے۔

(سورۃ سبا، 13) تماثیل تصاویر، نقشے، مجسمے وغیرہ۔ یہ جن معمار، مجسمے ساز، انجنیئر سنگ تراش، لوہار، ٹھٹھیرے اور مزدور کے طور پر کام کرتے تھے، جو انسانوں کے کام ہیں۔ اگر نظر نہ آنے والے معروف جن ہوتے تو ان سے ایسے مشقت والے کام لینا ممکن نہ ہوتا۔ سورہ جن میں ہے:

وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (72/6)

اور (میری طرف وحی کیا گیا) یہ کہ انس کے مرد جنوں کے مردوں (یعنی کاہنوں) کی پناہ میں آیا کرتے تھے۔ اور یوں انہوں نے ان کو سرکشی میں بڑھا دیا۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہوگا کہ لفظ رجال، جو رجل کا جمع کا صیغہ ہے، انسانوں کے لئے مخصوص ہے۔ کسی اور مخلوق کے لئے نہیں آتا اور قرآن مجید نے رجال کا لفظ جنوں کے لئے استعمال کر کے تصریح کر دی ہے کہ جن بھی انسان کی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یعنی انسانوں کی ایک قسم ہیں۔ پھر کاہن بھی انسان ہیں۔ جس طرح پیر، مولوی، بڑے بڑے جاگیردار اور وڈیرے اور سرمایہ دار بھی جنس انسانی سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے لوگ اپنی حاجت روائی کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ **ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مثلاً "میں نے اونٹوں یا فرشتوں کا ایک مرد دیکھا یا انکے کئی مرد دیکھے** (رایت رجلا او رجالا من الابل او الملائکۃ) کیا کاہن، پیر، مولوی، جاگیردار، وڈیرے یا سرمایہ دار ایسی خیالی مخلوق ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتے؟ کیا عام لوگ ان سے رجوع نہیں کرتے اور انکی پناہ نہیں لیتے؟

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ضعیف الاعتقاد لوگ روحانی عاملوں سے رجوع کرتے ہیں جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ جن ان کے قبضہ و تسلط میں ہیں اور لیتے رہتے ہیں۔ ہر لالچی کے لئے ایک جھوٹا موجود ہوتا ہے۔ روحانی عاملوں کا فراڈ پر مبنی یہ کاروبار بڑا منافع بخش ہے۔ کیا ایسے جن بھی ہیں جو نظر نہ آنی والی خیالی مخلوق ہیں۔ **عامدی صاحب کا اس خیالی مخلوق کو منوانے پر اصرار، جہالت اور ضلالت کی تائید کے مترادف ہے۔**

تفسیر خازن میں سورہ الناس کی تشریح و توضیح کے مطابق، **الناس کا لفظ جن و انس کے**

مابین مشترک ہے۔ یعنی جنوں پر بھی بولا جاتا ہے اور انس پر بھی۔ دوسرے لفظوں میں جن اور انس، الناس (آدمی) ہیں۔ تفسیر خازن نے اس کے ثبوت میں ایک عرب کا یہ قول نقل کیا ہے:

جاء قوم من الجن فقیل من انتم قالوا: الناس من الجن

(جنوں کے کچھ لوگ آئے تو ان سے پوچھا گیا تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ہم جن قوم کے انسان ہیں)

قوم کا لفظ انسانوں کی ایک جماعت کے معنی میں ہے۔ اور اُناس، انسی بمعنی بشر، کی ایک جمع ہے۔ جنوں کے یہ لوگ نظر آتے تھے، تبھی تو ان سے پوچھا گیا تھا کہ تم کون ہو؟ اگر وہ نظر ہی نہ آتے تھے تو ان سے پوچھنا کیسے ممکن تھا؟

"**الذی یوسوس فی صدور الناس ○ من الجنة و الناس**" کا معنی ہے جو آدمیوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے، جو جنوں اور دیگر انسانوں سے ہیں۔ **الوسواس الخناس** کا معنی ہے وسوسے ڈالنے والا (مصیبت میں ڈالکر) چھپ جانے والا (شیطان) **و کان الشیطان للانسان خذولا** (25/29) شیطان مصیبت کے وقت انسان کو چھوڑ کر چھپ جاتا ہے)۔

سورۃ الرحمٰن کی آیت 32 میں جن وانس کو "**یٰمَعْشَرَ الجن و الانس!**" کہکر خطاب کیا گیا جس کا معنی ہے: **اے جن وانس کی (آپس میں میل جول رکھنے والی) جماعت**۔ یہاں بھی جن سے مراد غامدی صاحب کے معروف جن نہیں۔ جو ایک خیالی نظر نہ آنے والی مخلوق ہے۔ کیوں کہ یہاں جن وانس کو ایک جماعت کہنے سے یہ بات کھل کر واضح ہوگئی ہے۔ کہ یہ دونوں (جن وانس) آپس میں میل ملاپ رکھتے ہیں۔ جبکہ معروف جن کہلانے والی مخلوق تو پوشیدہ اور آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ ایک دوسرے سے میل جول نہیں رکھتی اور صرف روحانی عامل یا انہی جیسے مدعیوں کے قبضہ وقدرت میں مبینہ طور پر پائی جاتی ہے۔ اور عامل لوگ ہزاروں میں شاید ایک دو سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کے قبضہ میں رہنے والے جن وہ جن نہیں جنکا ذکر قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اور جو انسانوں ہی کی ایک قسم ہیں۔

سورۃ الرحمٰن کی آیت 56 بھی ملاحظہ ہو، جو یہ ہے:

" فیھن قٰصِرٰت الطرف لم یطمثھن انس قبلھم و لا جان ؕ "

(ان بستروں میں) نیچی نگاہ والیاں ہیں ان سے پہلے نہ کسی انس نے ان کے ساتھ ملاپ کیا تھا اور نہ کسی جن نے)۔

اس آیہ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دنیا کی وہ عورتیں ہیں، جنہیں مرنے کے بعد آخرت میں لطیف جسم مل گیا۔ اوران سے پہلے کسی جن وانس نے ان سے مباشرت نہیں کی۔ **اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انس جنی عورتوں سے اور جن انسی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور دونوں قسم کی عورتیں ایک ہی جنس سے تعلق رکھتی ہیں۔** '' ان سے پہلے '' قبلھم کا ترجمہ ہے جسمیں ضمیر مجرور ھم کا مرجع ازواجھن سمجھا گیا ہے یعنی ان سے پہلے کا مطلب ان نیچی نگاہ والیوں کے شوہروں سے پہلے جوان کے سوا کسی اور کی طرف دیکھتی ہی نہیں بیبیوں

انس وجن (صفاتی نام ہونے کی وجہ سے) صفات کی بنا پر مختلف ہیں۔ اور یہ ایسا ہی فرق ہے، جیسے شہری اور دیہاتی میں، مہذب اور غیر مہذب میں، لیڈر اور عوام میں، ملاؤں اور ان کے پیروکاروں میں، پیروں اور انکے مریدوں میں خود مولویوں میں بعض پتلے دبلے اور بعض نرے گوشت کے پہاڑ ہوتے ہیں لیکن آپ انکے مولوی ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔

المعجم الوسیط کے مطابق... جِنُّ الشباب : عنفوانہٗ (جوانی کا آغاز)

جِنُّ النبات: پودے کے پھول اور کلیاں، جِنُّ الیل : رات کی سخت تاریکی

جِنُّ الناس: لوگوں کا ازدحام جو داخل ہونے والے کو چھپادے۔

المنجد کے مطابق لَا جِنَّ بھذا الامر کا معنی ہے اس معاملہ میں کوئی رازداری نہیں

المعجم الوسیط کے مطابق الانس کا ایک معنی الصدیق الصفی (مخلص دوست) بھی ہے جبکہ المنجد نے اِنْسُک کا معنی الیفک و حلَیفک تمہارا قریبی دوست اور اتحادی بتایا ہے۔

مجمع اللغۃ العربیہ کی طرف سے شائع ہونے والی معجم لالفاظ القرآن الکریم نے اَلْجِنّ کا معنی: **عالَمٌ مستتر لا یُریٰ لکھا ہے، یعنی پوشیدہ نظر نہ آنے والی مخلوق۔**

قرآن مجید کی سورہ الکہف کی آیت 50 کے مطابق ابلیس جنوں میں سے تھا، (کان من الجن)

امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن، ترجمہ و حواشی شیخ الحدیث محمد عبدہ فیروز پوری، ناشر اہل حدیث اکادمی، کشمیر بازار لاہور، سن طباعت جنوری 1971 کے صفحہ 194 پر ہے:

انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو "جن" کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے، لہٰذا تمام فرشتے جن ہیں، لیکن تمام جن فرشتے نہیں۔ اور بتایا ہے کہ بعض کے نزدیک یہ تین قسم کے ہیں 1) اخیار (نیک) یعنی فرشتے۔ (2) اشرار (بد) یعنی شیاطین۔ (3) اوساط: بعض نیک اور بعض بد، یعنی جن۔

لیکن قرآن مجید کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں شامل اور ان کے دربار اور ان کے لئے کام کرنے والے جن جنوں کا ذکر ہے وہ سب انسان ہی تھے۔ اور یوں وہ نہ تو خیالی پوشیدہ اور غیر مرئی مخلوق کے زمرہ میں آتے ہیں اور نہ پوشیدہ، نظر نہ آنے والی مخلوق کے زمرہ میں۔ دیو بھوت، چڑیلیں، پریاں وغیرہ خیالی مخلوق ہیں اور قرآن مجید میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ جن جنہوں نے قرآن سن کر اس کی اپنی قوم میں تبلیغ کی سلیم الفطرت یہودی کاہن تھے۔ سبزیاں، اناج اور پھل وغیرہ کھانے والے بھی سب انسان ہی ہیں، خیالی پوشیدہ اور غیر مرئی مخلوق نہیں۔ **وَهَلُمَّ جَرًّا**۔

علامہ راغب اصفہانی نے اوساط کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "سورہ الجن کی ابتدائی آیات قل اوحی الی .... و انا منا المسلمون و منا القاسطون (72/1-14) اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بد ہیں" سورہ الجن کی آیت 1، 2 قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ۝ {تو کہہ کہ میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ جنوں میں سے چند اشخاص نے (قرآن سننے پر) کان رکھا، پھر (اپنی قوم کے پاس جا کر) کہنے لگے کہ ہم نے

عجیب قران سنا ہے، جو اصلاح کی طرف راہنمائی کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اپنے پروردگار کے ساتھ آئندہ کسی ایک کو بھی ہرگز شریک نہیں کریں گے۔} ان جنوں کا سورہ احقاف میں بھی ذکر (46/29-32) موجود ہے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ کے پیروکار کاہن تھے۔ تمام انبیاء انسانوں کی طرف اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آئے تھے، لہٰذا یہ لوگ انسان تھے۔ جن وانس نوع انسان کے دو فریق ہیں، وَاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقَاسِطُوْنَ ٥ کا معنی ہے: "اور ہم میں سے (یعنی ہمارے جن وانس میں سے) بعض مسلم ہیں اور ہم میں سے بعض ظالم ہیں" اس سے بھی واضح ہے کہ اسلام لانے والے اور ظلم کرنے والے انسان ہی ہیں۔ جو انبیاء کی تعلیم پر چلیں وہ مسلم ہوتے ہیں اور جو نہ چلیں وہ ظالم ہوتے ہیں، یہ دونوں انسان ہی ہوتے ہیں۔ یہاں ظالموں کو جن کہا گیا ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں جن کا لفظ، فرشتوں شیطانوں اور انسانوں کی ایک قسم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن قرآن مجید کی بعض آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض انسان بھی شیطان ہوتے ہیں، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت 14 سے واضح ہے۔ جہاں ارشاد ہے: وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ (یہ جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے سرغنوں کے پاس خلوت میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بلاشبہ ہم تمہارے ساتھ ہیں (مومنوں سے) تو ہم صرف ٹھٹھا کرتے ہیں) اور جیسے سورہ بقرہ کی آیت 102 سے بھی واضح ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ... (حالانکہ سلیمان کافر نہیں تھا لیکن شیاطین کافر تھے، لوگوں کو جادو سکھاتے تھے) یہاں جادوگروں کو شیطان کہا گیا ہے اور سرغنوں کے لئے بھی شیاطین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر میں "جن" غیر شہری قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔

غامدی صاحب ذرا غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اناج، سبزیوں اور پھلوں کو جن وانس کے لئے اپنی نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے: فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ؟ (55/13)

کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اناج، سبزیاں اور پھل جن وانسان کی خوراک ہیں؟ اناج سبزیاں پھل کھیتوں اور باغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کھیت اور باغ انسان ہی کاشت کرتے ہیں۔ خواہ وہ معمولی کسان ہوں یا بڑے زمیندار اور وڈیرے انہیں مزدوروں سے کاشت کرواتے ہوں۔ یہ بڑے زمیندار اور وڈیرے ہی جن ہیں۔ کسی نظر نہ آنے والی جن نامی خیالی مخلوق کا ان کھیتوں اور باغوں کی کاشت، اناج اور پھلوں کے استعمال اور کھیتوں کی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن مجید نے جن وانس کی طرف معشر کے لفظ کی اضافت سے مزید واضح کر دیا ہے کہ **جن وانس آپس میں میل جول رکھتے ہیں**۔ ارشاد ہے: **یا معشر الجن و الانس** (55/32) جبکہ یہاں حال یہ ہے کہ بعض مولوی اور روحانی عامل ہی دعوی کرتے ہیں کہ ان کے قبضہ میں جن ہیں۔ یہ بات قرآن مجید کے خلاف جاتی ہے کیونکہ **یا معشر الجن و الانس** کا معنے ہے اے جن وانس کی (آپس میں میل جول رکھنے والی) جماعت! اور یوں ایسے مدعی جھوٹے اور فراڈیے ثابت ہوتے ہیں۔

سورہ انبیاء آیت 79 میں ہے:

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ○ سو ہم نے سلیمان کو اس (مقدمہ) کا خوب فہم دیا اور ہم نے ہر ایک (داؤد و سلیمان) کو حکمت (قوت فیصلہ) اور علم دیا اور ہم نے داؤد کے ساتھ **پہاڑوں (یعنی اہل جبال)** کو کام میں لگا دیا جو (صبح و شام) نمازیں پڑھتے اور تیز چلنے والوں) کو بھی (کام میں لگا دیا) اور ہم ہی کرنے والے تھے۔

آیت 34/10 میں ہے: **يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ** .....

ہم نے پہاڑوں (یعنی اہل جبال کو کہا کہ) تم (داؤد) کے ساتھ سارا دن چلو پھرو اور (تم بھی) اے تیز چلنے والو اس (داؤد) کی فرمانبرداری کیا کرو۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عمالقہ کا کوہستانی علاقہ حضرت داؤد کے ماتحت کر دیا تھا۔

حضرت داؤد کے بعد حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے۔ لہذا یہ علاقہ انکی تحویل میں آ گیا۔ بنی اسرائیل اس پہاڑی قوم عمالقہ کو جبارین کہتے تھے۔ سلیمانؑ کے لشکر میں شامل جن یہی قوم تھی کیونکہ غامدی صاحب کے معروف جن کی المنجد والی تعریف وہاں منطبق نہیں ہوتی۔ بلکہ نظر نہ آنے والی خیالی مخلوق ہونے کی وجہ سے قرآن مجید میں اسکے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

معجم القرآن از ڈاکٹر غلام جیلانی برقؒ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ طور سے نکل کر کنعان کی طرف چلے تو عمالقہ نے ان کا راستہ روکا۔ انہیں شکست ہوئی ..... عمالقہ چند وحشی قبائل تھے۔ ان کا پہلا تصادم اسرائیل سے سینا کے قریب ہوا اور شکست کھائی۔ پھر کنعانیوں کے ساتھ ملکر جنوبی فلسطین میں بنو اسرائیل پر دوبارہ حملہ کیا اور بنی اسرائیل کو شکست دی، چند صدیوں بعد طالوت نے ان پر حملہ کیا اور انکی تمام بستیاں کنعان سے حدود مصر تک روند ڈالیں انکی باقی ماندہ قوت پر حضرت داؤد نے ضربیں لگائیں اور یوں یہ مکمل طور پر تباہ ہو گئے۔ (صفحہ 89-188 عنوان جبارین)

جناب غامدی صاحب رقم طراز ہیں:

''اسی اصول کا اطلاق انہوں نے ''طیر'' پر بھی کیا، لیکن وہاں معاملہ کچھ الجھ گیا۔ ''طیر'' عربی زبان میں اتنا معروف اور عام استعمال ہونے والا لفظ ہے کہ کوئی دوسرا لفظ تلاش کرنا شاید مشکل ہو جائے۔ چونکہ وہ یہ مان کر دینے کے لیے تیار نہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں پرندے بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے انہوں نے اس معروف سے انحراف کی جو کوشش کی وہ علم کی دنیا میں ایک عجوبہ ہے۔ لفظ ''طیر'' کی تحقیق کے ضمن میں اس کے مختلف مفاہیم بیان کرتے ہوئے وہ لغات القرآن میں لکھتے ہیں:

فرس مطار۔ طیار ہوشیار اور تیز رفتار گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لشکر جن، انس، طیر پر مشتمل تھے۔ ''جن'' سے مراد وحشی قبائل ہیں ''انس'' مہذب آبادیاں اور طیر تیز رفتار گھوڑے۔ (لغات القرآن ج ۳ ص ۱۱۰۵)

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ مفہوم کہاں سے برآمد ہوا۔ عربی زبان کی تمام لغتوں میں اگر اس کے تمام استعمالات کو دیکھا جائے تو ایک مثال بھی ایسی پیش نہیں کی جا سکتی

کہ طیر گھوڑے کے لیے استعمال ہوتا ہو۔ ہم یہ جملہ کہہ سکتے ہیں "یہ گھوڑا کیا ہے؟ یہ تو اڑتا ہوا پرندہ ہے" یہاں جملہ خود بتا رہا ہے کہ گھوڑے کے لیے مجازا پرندے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ زبان و بیان کا ایک عام اسلوب ہے، لیکن اگر قرینہ موجود ہی نہیں تو پھر "طیر" کے معنی پرندے ہی کے ہوں گے۔ پرویز صاحب نے مثال دی **فرس** "مطار" یعنی تیز رفتار گھوڑا۔ اس مقام پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جب فرس کا لفظ بولا جائے گا اور ساتھ طیار بولا جائے گا تو یہ معنی اس میں پیدا ہو جائیں گے لیکن یہ معنی مجازا پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم مجازی مفہوم میں جہاز کو طیارہ کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب لفظ "طیر" جب سارے قرینوں سے بالاتر ہو کر آئے گا۔ یعنی اس کے ساتھ فرس نہیں لکھا گیا تو اس کے معنی گھوڑے کے کیسے ہو جائیں گے؟ وہ تو پرندہ ہی رہے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ پرویز صاحب کو بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ دور از کار تاویل ہے تو انہوں نے "مفہوم القرآن" میں اس کو مختلف انداز سے بیان کیا۔ یہاں انہوں نے لکھا:

سلیمان کے لشکروں میں شہروں کے مہذب باشندے، جنگلوں اور پہاڑوں کے دیو ہیکل وحشی اور قبیلہ طیر کے شاہسوار سب شامل تھے۔ (مفہوم القرآن ج ۲ ص ۸۶۴)

گویا لغات القرآن سے "مفہوم القرآن" تک آتے آتے تیز رفتار گھوڑے قبیلہ طیر کے شاہسواروں میں تبدیل ہو گئے۔ اگر پہلا مفہوم لیا جائے تو غرابت محسوس ہوتی ہے اس لیے یہاں انہوں نے یہ ترجمہ کر دیا۔ اب اس تاویل پر بھی ایک نظر ڈالیے۔ یہ "قبیلہ الطیر" کیا چیز ہے؟ کسی قبیلے کا نام قرآن نے لینا ہو تو کیا اس کا یہی طریقہ ہے؟

یعنی "**الطیر**" کہہ دیا جائے کہ ساری دنیا اس مصیبت میں پڑی رہے کہ "پرندے" ہیں اور اس سے اصلاً مراد ہو قبیلہ۔ اگر کسی قبیلے کا نام بھی "**الطیر**" ہو تو اس کے لیے بھی زبان اور بیان کا ایک قرینہ ہوگا، شواہد ہوں گے۔ زبان اور بیان کے قواعد میں وہ چیز موجود ہوگی کہ اس کو جان لیا جائے۔ قرآن مجید میں صحرا کے باشندوں، جنگل میں رہنے والے کے لیے معروف لفظ "اعراب" استعمال ہوا ہے۔ فرض کریں کہ حضرت سلیمان کے ساتھ لشکر میں

یہ لوگ تھے تو قرآن نے جہاں صحرا کے باشندوں کا ذکر کیا ہے تو کہا ہے و قالت الاعراب امنا اعراب ایک معروف لفظ ہے۔اب ایک معروف لفظ کو چھوڑ کر قرآن نے ایک نیا لفظ استعمال کیا جن ،جس سے نہ عربی زبان واقف تھی نہ عرب واقف تھے۔گویا کسی طرح بھی یہ تاویل اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔"

طَارَ یَطِیْرُ طَیَرَانًا و طَیْرُوْرَةً کا معنی تیزی سے جانا یا تیز چلنا ہے۔اگر صلہ الی کے ساتھ ہو،تو معنی کسی شخص یا جگہ تک تیز چل کر جانا ،دوڑ کر جانا ہے۔اگر فاعل طَائِرٌ ہو تو "پرندہ کا اڑنا" کے معنی میں ہوتا ہے۔آج کل کوئی شخص ہوائی جہاز سے کسی جگہ جائے تو عربی میں کہیں گے:طَارَ اِلٰی مَکَانَ کذا۔مثلا زید بذریعہ ہوائی جہاز لندن گیا کو عربی میں طار زید الی لندن کہیں گے۔دیوان الحماسہ میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

قَوْمٌ اِذَا الشَّرُّ اَبْدٰی نَاجِذَیْهِ لَهُمْ طَارُوْا اِلَیْهِ زَرَافَاتٍ وَوُحْدَانًا

وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب لڑائی انکے لئے اپنی کچلیاں نکالتی اور درندے کی طرح ڈرانے لگتی ہے تو وہ جوق درجوق اور اکیلے اکیلے اسکی طرف اڑ کر پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ترجمہ مولانا حافظ محمد اسحاق لاہوری کا ہے۔ دیوان الحماسة ،المکتبة السلفیه ،شیش محل روڈ،لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے۔شعر میں جن لوگوں کا ذکر ہے وہ قبیلہ"مازن" سے تعلق رکھتے ہیں۔مراد بنو مازن اتنے بہادر ہیں کہ جنگ کا نام سنتے ہی اکٹھے اور اکیلے اکیلے جنگ میں کود پڑنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔غامدی صاحب نے "جنگلوں اور پہاڑوں کے دیوہیکل وحشی" کے مقابل اعراب لفظ تجویز کیا ہے۔اس لفظ اعراب کے خود ان کے بتائے گئے معنی "صحرا کے باشندے،جنگل میں رہنے والے"،"جنگلوں اور پہاڑوں کے دیوہیکل وحشی" کے ہم معنی نہیں سمجھے جاسکتے۔

سلیمان کے لشکر میں طیر سے مراد بھی یہ ہے کہ لشکر میں سریع الحرکة فوج Rapid Movement Force بھی شامل تھی۔جیسا کہ آج کل امریکی افواج میں اس نام کی فوج شامل ہوتی ہے۔غامدی صاحب نے غور نہیں کیا کہ فوج میں کئی قسم کے دستے ہوتے

ہیں۔ سلیمانؑ کے زمانہ میں سریع الحرکت فوج کے شہسواروں پر مشتمل ہونے پر اعتراض کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر ان کے نزدیک فوج میں پرندے بھی تھے، تو وہ چند نامہ بر کبوتر ہو سکتے تھے۔ **لیکن اس مفہوم میں لینے سے بات نہیں بنتی کیونکہ اس کے بعد فھم یوزعون کہا گیا ہے۔ جس کا معنی ہے کہ یہ فوجی لوگ (ملک کے ہر شہر پر) روکے جاتے تھے** (تا کہ ان شہروں سے بھی فوج کی مناسب مدد لی جائے) نامہ بر کبوتر تربیت یافتہ ہوتے ہیں اور انہیں جس جگہ بھیجا جائے وہ سیدھے وہیں چلے جاتے ہیں۔ غیر تربیت یافتہ پرندوں کو بھرتی کرنے کے لئے انہیں روکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ طیر نام کے قبیلہ پر ناک بھوں چڑھانا بھی درست نہیں۔ خود "نمل" ایک قوم کا نام ہے جس طرح مازن ایک قبیلہ کا نام ہے، حالانکہ مازن کا معنی "چیونٹی کے انڈے ہے"۔ اور یہ بغیر "بنو" کے سابقہ کے استعمال ہوا ہے۔ جس طرح قرآن میں بھی "بنو نمل" نہیں کہا گیا۔

منتھی الارب میں نمل کے متعلق لکھا ہے "وازا علام است" یعنی نمل کا لفظ اسم علم یعنی خاص نام کے طور پر بھی آتا ہے۔ جس وادی میں یہ قوم بستی تھی اُسے قرآن میں واد النمل کہا گیا ہے۔ تفصیلی گفتگو آگے چل کر کی جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ شام میں ایک شہر کا نام طیر (Tyre) ہے۔ جہاں اس نام کی ایک قوم آباد تھی۔ جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے۔ جو پرندہ اپنے بازوؤں کے ذریعے اڑے (یطیر بجناحیہ) وہ طائر کہلاتا ہے اور جو سریع السیر ہو وہ بھی طائر کہلاتا ہے۔ آیہ زیر بحث میں چونکہ سلیمانؑ کے لشکر میں طیر کی شمولیت کا ذکر ہے وہاں طیر سے (جو طائر کی جمع ہے) تیز رو فوجی دستے مراد ہیں۔ تفاسیر میں طیر سے مراد پرندے لئے گئے ہیں، جنکا کام فوج پر سایہ کئے رکھنا بتایا گیا ہے۔ فوجی جہاں پڑاؤ کرتے ہوں گے وہاں یہ پرندے اُن کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہوں گے۔ یا پھر انہیں نیچے اتر کر چگنے کی اجازت دیدی جاتی ہوگی۔ غامدی صاحب نے ان پرندوں کے مصرف پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ فوجیوں کو سایہ میں رکھنا انہیں آرام طلب بناتا ہے۔

غامدی صاحب اپنا خطاب جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس کے بعد پرویز صاحب فرماتے ہیں جب یہ لشکر تیار ہو گئے حتی اذا اتو اعلی وادالنمل یہاں تک کہ وہ وادی نمل میں آئے۔''

نمل عربی زبان کا معروف لفظ ہے جو چیونٹیوں کے لئے بولتے ہیں۔ یعنی مطلب ہو گا کہ چیونٹیوں کی وادی میں آئے۔ یہ قرآن مجید کا مشہور مقام ہے لوگ اسے جانتے بھی ہیں لیکن پرویز صاحب کے لیے یہ بڑا مشکل مقام ہے۔ جو آگے بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں چیونٹی نے گفتگو کی اور حضرت سلیمانؑ نے سن لی۔ ان کے لیے یہ ماننا بہت مشکل کام ہے۔ وہ اپنے ذوق کے تحت اس کو نہیں ماننا چاہتے۔ اس لیے انہوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ دلچسپ ہے وہ لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہوا کہ سبا کی مملکت ان کے خلاف سرکشی کا ارادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ بطور حفظ ماتقدم اس کی طرف لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ راستے میں وادی نمل پڑتی تھی۔ ملکہ سبا کی طرح اس مملکت کی سربراہ بھی ایک عورت تھی۔ جب اس نے اس لشکر کی آمد کی خبر سنی تو اپنی رعایا کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں میں جا کر پناہ گزیں ہو جائیں۔ (مفہوم القرآن ج ۲ ص ۸۶۴)

''یہاں ان کے نزدیک نملہ ایک عورت کا نام ہے جو وادی نمل کی تھی۔ اب دیکھئے کہ یہ تسلیم کرنے سے کیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید نے کہا قالت نملة، نمل اسم جنس ہے۔ نملة چیونٹی کو کہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ عورت اس قبیلے کی سربراہ تھی تو عربی کے کس قاعدے کی رو سے یہ نکرہ استعمال ہو سکتا ہے۔ اسے ایک نملہ A NAMLA تو نہیں کہہ سکتے ''THE NAMLA'' ہی کہیں گے۔ لیکن قرآن میں تو یہاں قالت نملة ہے یعنی نکرہ استعمال ہوا ہے۔ دوسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ نملہ اس کا نام تھا۔ یہ بات تو نمل سے معلوم ہوتی ہے جو صحیح نہیں کیونکہ یہ عربی زبان کے معروف استعمال کے خلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی عورت قبیلہ اوس کی ہو تو اس کو عربی میں کیا کہیں گے؟ اوسہ یا اوسیہ اگر قبیلہ بنی عبدالشمس کی ہو تو کیا کہیں گے؟ عبدالشمسیہ کہیں گے کہ عبدالشمسہ؟ یعنی اگر

فرض کیجئے کہ قرآن مجید نے یہاں کہنا ہوتا کہ "قبیلہ نمل کی عورت" تو قرآن کہتا قالت نملیۃ جب آپ پاکستانی بولیں گے تو نسبت کے لیے "ی" لگائیں گے اس کے بعد لفظ میں یہ مفہوم پیدا ہوگا۔ پرویز صاحب نے ان سب چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے، جو زبان کے مسلمہ اصول ہیں۔ ان سب کو نظر انداز کر کے فرمایا: "ان کی سربراہ بھی ایک عورت تھی" اور اس کا نام اس لیے نملہ آیا ہے کہ وہ قبیلہ نمل سے تعلق رکھتی تھی۔ یعنی یہاں اگر فرض کر لیجئے کہ اس کو قبیلہ نمل کی عورت کے معنی میں لیں تو یہ کہا جائے گا کہ ایک عورت نے کہا اگر اس کو ان معنوں میں لینا چاہیں تو عربی زبان کی رو سے یہ ضروری ہوگا کہ قالت نملیۃ کہا جائے۔ گویا علاقے سے نسبت کریں یا قبیلے سے بہر حال اسی طرح بولیں گے۔"

اس موضوع پر جناب طالب محسن، استاذ کلیۃ حدیث ماہنامہ اشراق کے شمارہ مئی 1996، شمارہ اکتوبر 1997، شمارہ اگست 1998 اور شمارہ نومبر 1998 میں پہلے لکھ چکے ہیں۔ خاکسار نے جناب طالب محسن کے رد میں جو مقالات لکھے، وہ طلوع اسلام کے دو شماروں، جنوری 1998 اور اکتوبر 1998 اور مجلہ "صوت الحق" پشاور کے شمارہ مارچ 1999 میں شائع ہوئے تھے۔ اس سے قبل علامہ رحمت اللہ طارق مرحوم کے مقالات اسی موضوع پر مجلہ طلوع اسلام میں شائع ہوئے تھے۔ غامدی صاحب نے اب پھر وہی باتیں چھیڑ دی ہیں۔ اور نمل بمعنی چیونٹیاں اور نملہ بمعنی ایک چیونٹی کا راگ دوبارہ الاپنا شروع کر دیا ہے۔

تفسیر بیان للناس میں ہے کہ "عرب لوگ قوموں اور شخصوں کے نام جانوروں کے ناموں پر رکھتے تھے۔ مازن کے معنے ہیں "چیونٹی کے انڈے" اور عرب میں ایک مشہور قوم کا نام بھی تھا۔ یہی حال نمل کا بھی ہے۔ منتھی الارب میں نمل کے متعلق لکھا ہے "واز اعلام است" یعنی نمل کا لفظ اسم علم یعنی خاص نام کے طور پر بھی آتا ہے۔ (تفسیر بیان للناس منزل پنجم صفحہ 55)

المنجد میں ہے: الزَنج و الزِنج جمع زُنوج :قوم من السودان واحدھم زِنجی وقد یقال لہ زَنج : ایک حبشی قوم واحد کو زنجی اور کبھی زنج بھی کہا جاتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ہر لفظ کا واحد جمع کا قاعدہ یکساں نہیں۔

غور کرنے کی بات ہے کہ کیا چیونٹیاں بولتی ہیں؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مصطفیٰ محمود نے اپنی ایک کتاب "الشیطان یحکم" میں جو دار العودۃ بیروت کی طرف سے شائع ہوئی ہے لکھا ہے:

وعلماء البیولوجیا یقولون لنا ان النمل یتخاطب عن طریق القبلات بلغۃ کیمیائیۃ خاصۃ یفرزھا مع اللعاب (ماہرین حیاتیات ہمیں بتاتے ہیں کہ چیونٹیوں کی آپس میں گفتگو بوسوں (کے تبادلہ) کے ذریعے خاص کیمیائی الفاظ میں ہوتی ہے جو چیونٹیاں لعاب دہن کے ساتھ نکالتی ہیں۔)

چیونٹی کی تو آواز بھی نہیں نکلتی۔ اربوں چیونٹیاں ملکر چلائیں تو بھی آپ کے کان ان کی آواز نہیں سن سکتے۔ تو قالت نملۃ کا معنی ایک چیونٹی نے کہا کیسے لیا جا سکتا ہے؟ پھر چیونٹی کوئی پرندہ نہیں کہ علمنا منطق الطیر کہنے والے حضرت سلیمانؑ نے چیونٹی کی بات سنکر ایسا تبسم کیا جو ہنسنے کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ چیونٹی قوت گویائی سے طبعی طور پر محروم ہے۔ انکی دوسری چیونٹیوں سے گفتگو بوسہ بازی کے ذریعے ہوتی ہے، جو آواز سے خالی ہے۔ سلیمانؑ کو منطق الطیر کا علم تھا۔ چیونٹیاں حشرات الارض میں شمار ہوتی ہیں انہیں حشرات الارض کی بولیاں سکھانے کا کوئی ذکر نہیں۔ آپ کا چیونٹی کی بغیر آواز بات سمجھ لینا ہی غیر منطقی ہے۔ اور قرآن مجید سے اس قسم کے مفہوم برآمد کروانا وضعی روایات سے ہی ممکن ہے۔ چیونٹیوں کی وادی پر لشکر کشی بھی مضحکہ خیز ہے، جو حضرت سلیمانؑ جیسے جلیل القدر نبی کی طرف منسوب کرنا ناقابل تصور ہے۔

نملۃ، نمل کا واحد ہے، مذکر ہو یا مونث۔ آیت (27/18) میں قالت نملۃ ہے: یعنی ایک نملہ (خاتون) نے کہا۔ اس کا نملہ قوم کے لوگوں سے اپنے اپنے گھروں میں گھس جانے کے لئے کہنا ظاہر کرتا ہے کہ وہ جاہ وجلال کی مالک اور بالادست حیثیت کی حامل تھی۔

اگر قبیلہ اسد کے کسی شخص کا نام اسد ہو تو اُسے اسد ہی کہا جائے گا اسدی نہیں۔ کیونکہ اسدی کہنے سے مراد ایسا شخص ہے جس کا تعلق قبیلہ اسد سے ہو یعنی اسدی میں 'ی' یائے نسبتی ہے۔

مکمل بحث کے لئے ملاحظہ ہوں، مجلہ طلوع اسلام، جنوری، اکتوبر 1998 اور مجلہ صوت الحق مارچ 1999

عربی تفاسیر سے واضح ہے کہ چیونٹیوں کے معنی میں النمل کے لئے ادخلوا کے بجائے ادخلن کا صیغہ آنا چاہیے تھا، اسی طرح مساکنکم کی جگہ مساکنکن اور لا یحطمنکم کے بجائے لا یحطمنکن ہونا چاہیے تھا۔ مجازی طور پر نمل کے لئے ذوی العقول کے لئے مخصوص صیغوں کے استعمال سے یہ سمجھا جائے گا کہ ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں کو اپنے اپنے گھروں میں گھس جانے کا کوئی حکم نہیں دیا، یہ ایک فرضی داستان ہے۔ اور مقصود سنسنی خیزی ہے۔

علامہ رحمت اللہ طارق مرحوم نے اپنے مضامین میں جو طلوع اسلام میں شائع ہوئے یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ مدینہ میں ایک جوہری کا نام عبدالرحمن النملہ ہے۔ طالب محسن صاحب نے اعتراف کیا کہ "عبدالرحمن النملہ کی مثال سے صرف یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عرب میں ایک خاندان کا نام نملہ بھی ہے۔ (اشراق اکتوبر 97 صفحہ 42) یہ اعتراف اس بات کا ثبوت ہے کہ طالب محسن صاحب نے تسلیم کر لیا ہے کہ عربوں میں ایک نملہ نامی خاندان بھی ہے، جس کے افراد اپنے نام کے ساتھ نملہ کا لفظ اپنے خاندان کی پہچان کے طور پر لکھتے ہیں۔ مرد نملی اور عورتیں نملیہ نہیں لکھتیں۔ لہٰذا طالب محسن صاحب اور غامدی صاحب کا اس کے باوجود یہ اصرار کہ قالت نملة کے بجائے قالت نملية ہونا چاہیے تھا، سراسر غلط ہے۔ تمام زبانوں کے اپنے قواعد ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود بعض قیاسی اور بعض سماعی کہلاتے ہیں۔ اور انمیں استثناء بھی ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں ملکہ سبا کے لئے امراۃ تحکمھم کہا گیا ہے، یعنی امرأۃ نکرہ استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ اس کا نام بلقیس بتایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنی قوم کا ذکر بھی کرتے ہیں، کوئی گکھڑ، کوئی کھوکھر اور کوئی جٹ قوم سے ہوتا ہے، مگر اپنے نام کے ساتھ، گکھڑی، کھوکھری، جٹی نہیں لکھتا۔

اس کے بعد غامدی صاحب لکھتے ہیں:

"اب اسی سورہ میں پہلے ذکر ہوا ہے کہ علمنا منطق الطیر یعنی حضرت سلیمانؑ نے اپنے اوپر اللہ کا یہ احسان بیان کیا ہے کہ ہم کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے۔ منطق، معروف لفظ

ہے۔طیر بھی معروف لفظ ہے۔ پرویز صاحب کے لئے یہ ماننا مشکل ہے کہ سلیمانؑ کو پرندوں کی زبان سکھائی گئی۔ان کے نزدیک طیر سے مراد ہے گھوڑوں کا لشکر اور علمنا منطق الطیر سے مراد ہے گھوڑوں کے لشکر کو سدھانے اور استعمال میں لانے کے قواعد وضوابط اللہ تعالیٰ نے ہم کو سکھائے (مفہوم القرآن ج ۲ ص ۸۶۳) سوال یہ ہے کہ کیا عربی زبان کا کوئی جاننے والا لفظ منطق کو اس معنی میں بولے گا، طیر کو اس معنی میں بولے گا؟ اس کا کوئی امکان نہ اُردو میں ہے نہ عربی میں۔"

"اس کے بعد دیکھئے کہ جہاں پر ملکہ سبا کا تخت لانے کا ذکر ہے حضرت سلیمانؑ نے کہا: قال یا یھا الملؤا ایکم یا تینی بعر شھا یعنی مجھے کون اس کا تخت لا کر دے گا۔ سادہ ترجمہ ہے۔اس کے سوا لفظوں کا مفہوم وہ بھی کوئی اور نہیں کر سکتے۔ پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت سلیمانؑ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اس کے پایہ تخت کو کون فتح کر کے دے گا؟ جملے کا سیاق وسباق، زبان کے قواعد اور استعمالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں بھی اس مفہوم کو اختیار کرنا ممکن نہیں۔"

"اب اگر بعد کے واقعات کو بھی دیکھا جائے جن میں ملکہ بلقیس کے تخت کو لانے، اُس کے مفتوح ہونے اور ایک کتاب کا علم رکھنے والے صاحب کا ذکر ہے جنہوں نے حضرت سلیمان سے کہا، وہ پلک جھپکنے تک ملکہ کے تخت کو اُن کے حضور میں پیش کر دیں گے، تو عجیب وغریب صورت حال پیش آتی ہے۔ چونکہ پرویز صاحب اس طرح کی کسی بات کو تسلیم کرنے لیے آمادہ نہیں اس لیے وہ ان مقامات پر بھی عربی زبان اور قرآن مجید کے الفاظ کو تختہ مشق بناتے ہیں۔اور وہ مفہوم برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو متکلم کے پیش نظر نہیں تھا۔ قرآن مجید کے ایک سچے طالب علم کا رویہ تو یہ ہونا چاہیے کہ وہ قرآن مجید کو خالی الذہن ہو کر پڑھے، اور اس پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، اسے قبول کرتا جائے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن نے غور وفکر کی دعوت دی ہے لیکن یہ غور وفکر کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند ہونا چاہیے۔اگر ہم قرآن کے الفاظ اس کے اسالیب اور ہر چیز کو نظر انداز کر کے اس

سے وہ خیالات برآمد کرنا چاہیں جو ہمیں پسند ہیں تو منطق اور عقل کے ہر پیمانے سے یہ تحریف کہلائے گی۔ سورہ نمل کے ساتھ جو سلوک پرویز صاحب نے کیا وہ دراصل ان کی قرآن فہمی کی ایک مثال ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ قرآن کو کیا سمجھتے ہیں اور انہیں کتاب اللہ کا کتنا احترام ہے اور اپنے خیالات کے سامنے قرآن کو کس مقام پر رکھتے ہیں؟''

علمنا منطق الطیر (19/16) پر آیت 19/20: **وتفقد الطیر** الخ کی روشنی میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سلیمانؑ کے لشکر میں تیز رو فوجی دستہ سے جاسوسی کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ اور یہ لوگ دشمن کے علاقہ سے معلومات حاصل کر کے انہیں بسرعت تمام فوجی حکام کو منتقل کر دیتے تھے۔ لہذا یہاں منطق الطیر سے مراد جاسوسوں کی بولی ہے اس بولی کو متعلقہ حکام ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس دستہ کا افسر ھدھد اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے سلسلہ میں ملک سبا چلا گیا تھا اور وہاں سے اہم معلومات لے کر لوٹا تھا۔ قرآن حکیم نے اسکی طرف جو باتیں منسوب کی ہیں وہ کسی پرندے سے متوقع نہیں۔ پرویز صاحب کو غلطی لگی ہے، کہ **منطق الطیر** سے گھوڑوں کے لشکر کو سدھانے اور استعمال میں لانے کے قواعد وضوابط مراد لی ہے۔

جہاںتک غامدی صاحب کے یہ کہنے کا تعلق ہے کہ:

''پرویز صاحب کہتے ہیں کہ اصل میں حضرت سلیمانؑ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اسکے پایہ تخت کون فتح کر کے دیگا؟ جملے کا سیاق وسباق، زبان کے قواعد اور استعمالات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہاں بھی اس مفہوم کو اختیار کرنا ممکن نہیں''

تو عرض ہے کہ غامدی صاحب پرویز صاحب کا ترجمہ:

''مجھے اس کے پایہ تخت کو کون فتح کر کے دے گا'' کو اسی قبیل کا مفہوم سمجھیں جو انہوں نے آیہ **فلما رأته حسبته لجة و کشفت عن ساقیها** کی **صرحا تحریح** کر کے دکھایا ہے اور جس کے تعلق غامدی صاحب کا دعوی ہے کہ ''اب کوئی کس اصول کے تحت اس مفہوم کی نفی کر سکتا

ہے اس لئے کہ ان میں وہ سارے الفاظ بھی موجود ہیں وہ سب چیزیں بھی موجود ہیں، یہاں مسئلہ کوئی نہیں ہے، یہاں وہی مفہوم ہے''۔

قارئین غامدی صاحب نے پرویز صاحب کے اصول پر اپنی تشریح کر کے اسکی تصویب کردی ہے۔ پھر پرویز صاحب پر اعتراض کا کیا جواز ہے؟۔

پرویز صاحب نے غالباً سورہ النمل کی آیت 31: ''الا تعلوا علی واتونی مسلمین'' (تم مجھ پر چڑھائی نہ کرو اور صلح میں داخل ہو کر آؤ) اور آیت 37 ''ارجع الیھم فلنا تینھم بجنود لا قبل لھم بھا ولنخرجنھم منھا اذلۃ وھم صاغرون'' (اے ہدہد) تو ان کی طرف مڑ جا (اگر وہ بھی صلح نہیں کرتے اور اپنی بہادری دکھاتے ہیں تو) پھر ہم ان پر اپنی فوجیں لائیں گے جسکا وہ مقابلہ نہیں کرسکیں گیا اور ہم انہیں اس (حکمرانی) سے ذلیل بنا کر خارج کردیں گے اور وہ ماتحت ہو کر رہیں گے) کو پیش نظر رکھ کر وہ مفہوم لیا ہے۔ جس پر غامدی صاحب معترض ہیں۔ بہر حال اگر یہ مفہوم صحیح نہیں تو غامدی صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ دلائل و براہن سے اسکی غلطی واضح کرتے۔ آیت 31 حضرت سلیمانؑ کے ملکہ سبا کے نام خط کے مضمون کا ایک حصہ اور آیت 37 وہ پیغام ہے جو حضرت سلیمانؑ نے ہدہد کے ذریعہ ملکہ کو بھیجا تھا۔ لیکن اس دھمکی پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ ملکہ خائف ہو کر صلح کے لئے آنے پر رضا مند ہو گئی۔ اور اس مفہوم کا حامل خط بھیج دیا۔ اس کے آنے سے پہلے حضرت سلیمان نے اس کا تخت کسی دوسرے راستہ سے منگوا کر اس میں کچھ تبدیلیاں کروالیں تا کہ ملکہ کی عقل کا امتحان لیا جائے۔ ملکہ ذہین تھی وہ اس امتحان پر پوری اتری جیسا کہ اس کے اس قول سے ظاہر ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی تخت ہے (یعنی میرا ہی تخت ہے۔) ''کانہ ھو (آیت 42)''

قال یٰایُّھا الملؤا ایکم یا تینی بعرشھا قبل ان یا تونی مسلمین (آیت 38) (جب سلیمانؑ کو خبر ملی کہ وہ صلح کی ملاقات کے لئے آئیں گے تو) انہوں نے کہا اے (میرے) سردارو تم میں سے کونسا ہے جو اُس (ملکہ) کے تخت کو میرے پاس لائے اس سے پہلے کہ وہ میرے پاس صلح کی

ملاقات کے لئے آئیں؟)

لہٰذا پرویز صاحب سے یہاں تسامح ہوا ہے۔ انہوں نے بعد کی آیات پر غور نہیں کیا۔ سلیمانؑ کے قول: یاایھا الملؤا" سے ظاہر ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے دربار میں جن وانس (ملک کے اصل باشندے اور فاتح قوم) کے نمائندے تھے اور انکے اجلاسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ جو تفاسیر کے مطابق دو پہر تک جاری رہا کرتے تھے۔ سلیمانؑ کے استعفسار پر، جن قوم کے ایک شہزور (عفریت من الجن) نے کہا: "انا آتیک به قبل ان تقوم من مقامک" (میں یہ (تخت) آپکے اپنی جگہ سے اٹھنے (یعنی اجلاس ختم ہونے سے) پہلے ہی آپکے پاس لے آؤں گا) یہ جن وہی تھے جن کے ہم قوم سلیمانؑ کے تعمیراتی اور صنعتی کام سرانجام دیا کرتے تھے، عمارتیں، قلعے، مجسمے اور بڑی بڑی دیگیں وغیرہ انکے منشا کے مطابق بنایا کرتے تھے، مزدور بھی تھے انجنیئر بھی تھے، لوہار، بڑھئی اور کسیرے وغیرہ بھی تھے، اور ظاہر ہے کہ یہ سب کام انسان کیا کرتے ہیں، نہ کہ خیالی غیر مرئی مخلوق جن کے وجود کے قائل روحانی عامل، اور جن نکالنے والے مولوی وغیرہ ہیں۔ اور اس طرح لوگوں کو بیوقوف بنا کر ان کا استحصال کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

غامدی صاحب نے اپنے خطاب میں پرویز صاحب کے فہم قرآن کے اصول کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"سورہ تکویر قرآن مجید کی معروف سورۃ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ انسان کو خبر کے انداز میں اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝ وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۝ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ ۝

جب کہ سورج کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور تارے بے نور ہو جائیں گے، پہاڑ چلا دیے جائیں اور دس ماہ کی گابھن اونٹنیاں آوارہ پھریں گی۔ وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے اور سمندر

ابل پڑیں گے۔ جبکہ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی اور زندہ درگور کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ پر ماری گئی۔ جبکہ اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ اور آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی۔ جب کہ دوزخ بھڑکا دی جائے گی اور جنت قریب لائی جائے گی، تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لے کر آئی ہے۔

اس سورۂ میں قیامت کے اس زلزلے کا ذکر ہے جس میں پہاڑ اپنی جگہ سے چل پڑیں گے۔ ستارے اپنے مقام سے گر پڑیں گے۔ سورج پر تیرگی چھا جائے گی۔ اس میں وہ آیت بھی آتی ہے جو قرآن مجید کے اسلوب کا شاہکار ہے کہ زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کس گناہ میں قتل کیا گیا۔ کیونکہ عرب لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اس کے لئے ''موءٗدۃ'' کا لفظ کلام عرب میں اتنا عام لفظ ہے کہ جسکی کوئی حد نہیں۔

اب ذرا دیکھئے کہ پرویز صاحب ان آیات کا مفہوم کس طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

کسی آنے والے دور میں جب انسانوں کے خود ساختہ نظام تمدن و معاشرت کی جگہ قرآنی نظام لے لے گا تو اس وقت کی انقلابی کیفیات سے متعلق یوں سمجھو کہ ملوکیت کا نظام لپیٹ دیا جائے گا اور ان کے اہالی موالی (چھوٹی چھوٹی ریاستیں) سب جھڑ کے نیچے گر جائیں گی۔ ان کا شیرزاہ بکھر جائے گا۔ ان کی قوت ماند پڑ جائے گی اور پہاڑوں جیسے محکم امراء و رؤسا اپنی اپنی جگہ سے ہل جائیں گے اور جن ذرائع رسل و رسائل (مثلاً اونٹوں) کو اس وقت اتنی اہمیت دی جا رہی ہے وہ سب بے کار ہو جائیں گے اور وحشی اور نامانوس قومیں بھی اجتماعی زندگی کی طرف آتی جائیں گی اور سمندروں میں آمد و رفت کا سلسلہ اتنا وسیع ہو جائے گا کہ ہر وقت بھرے دکھائی دیں گے اور ان کے کناروں کی بستیاں بھی بڑی آباد ہو جائیں گی اور اطراف اکناف کی آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی جائیں گی۔ جب ان لڑکیوں کے متعلق جنہیں معاشرہ زندہ درگور کر دیتا ہے اور ان بے چاریوں کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا۔ پوچھا جائے گا کہ انہیں بالآخر کس جرم کی پاداش میں ذبح کیا جاتا رہا (یعنی عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جائیں گے) اور اخبارات و رسائل جگہ جگہ پھیل جائیں گے اور اجرام فلکی پر پڑے ہوئے پردے ایک ایک کر کے اٹھتے چلے جائیں گے (ان کے حالات دریافت کیے جائیں گے) تو اس وقت خدا کے قانونِ مکافات کا عمل تیز تر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس وقت آخر الامر وہ نظام

متشکل ہو جائے گا جس میں ہر معاملہ انصاف اور قانون کے مطابق طے پائے گا، لہٰذا اس کی رو سے مجرمین کے لیے جہنم کے شعلے زیادہ تیزی سے بھڑک اٹھیں گے اور اس نظام کی پابندی کرنے والوں کے لیے جنتی معاشرہ قریب تر لایا جائے گا یعنی اس وقت ہر شخص اپنے اپنے عمل کے نتائج اپنے سامنے بے نقاب دیکھے گا۔ (مفہوم القرآن ج ۳ ص ۱۴۱۸، ۱۴۱۹)

اب اس پر کیا تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان کے جن اصولوں کا ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے اس کی روشنی میں دیکھ لیجئے انہوں نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے زبان کے عرف کو زبان کے سیاق کو، اس کے سباق کو الفاظ کے ان مدلولات کو جو واضح ہیں۔ تشبیہ اور تمثیل کے ان طریقوں کو، جن میں دوسری رائے نہیں ہو سکتی، بالکل تلپٹ کر کے ہمیں اخبارات اور رسائل کی دنیا میں پہنچا دیا ہے اور وہ ''زندہ گاڑی ہوئی لڑکی'' واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کو پڑھ کر طبیعت لرز اٹھتی ہے، معلوم ہوا کہ قرآن نے اس زمانے کا ذکر کیا ہے جب عورتوں کو ان کے حقوق دلائے جا رہے ہیں۔ یعنی تحریک آزادی نسواں (FEMINISM) کا تذکرہ ہے۔ اس ترجمہ کی روشنی میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پرویز صاحب نے قرآن کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں جہاں بھی کوئی چیز ان کے مدعا کے خلاف محسوس ہوئی اس کو انہوں نے تبدیل کر دیا۔ وضاحت کے لیے ہم ایک مرتبہ پھر سورہ نمل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حضرت سلیمان نے جب ملکہ سبا کو شکست دے دی اور وہ سارے معاملات ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت سلیمان کے دربار میں وہ آئیں۔ پرویز صاحب کے نزدیک اس سے پہلے تک سب کچھ تمثیل تھی یعنی اس میں مجازی مفہوم تھے ''تخت'' سے مراد ''پایہ تخت'' تھا اس کو لانے سے مراد اس کو فتح کرنا تھا۔ اس کے بعد **قیل لها ادخلی الصرح** جب وہ آئیں تو ان سے کہا گیا کی آپ: راشیش محل میں داخل ہو جایئے۔ **فلما رانه حسبته لجة و کشفت عن ساقیها** جب انہوں نے اس کو دیکھا کہ یہ تو پانی موجیں مار رہا ہے تو انہوں نے اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا لیا۔ **قال انه صرح ممرد من قوارير** تو حضرت سلیمان نے کہا نہیں یہ تو اصل میں شیشہ لگا ہوا ہے اور بہت صفائی سے لگا ہوا ہے۔ یہ مشہور واقعہ ہے۔ اس میں پرویز صاحب کو کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا تو انہوں نے اس کا بالکل وہی مفہوم بیان کیا

جو ہم نے بیان کیا ہے۔ یہاں نہ مجاز ہے نہ تمثیل۔ اگر انہی کے اصول پر اس کی تشریح کی جائے تو یہ کہا جائے گا: ''جب وہ آئیں تو ان سے کہا گیا کہ آپ اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کے شیش محل میں داخل ہو جایئے۔ جب وہ اس میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اس کو دیکھا، پھر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں پر ایک نگاہ ڈالی تو انہوں نے خیال کیا کہ یہ تو اصل میں سراب ہی ہے۔ اس وقت وہ بیچاری اپنی تمناؤں سے پیچھے ہٹنے کے لیے فوراً اپنی پنڈلیوں سے کپڑا اٹھا کر بالکل مستعد ہو گئیں (یہ عربی کا محاورہ ہے ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے) تو سلیمانؑ نے کہا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے، درحقیقت تمہاری تمنائیں شیشے کا محل ہی تو تھیں جن میں تم زندگی بسر کر رہی تھیں''۔

اب کوئی کس اصول کے تحت اس مفہوم کی نفی کر سکتا ہے اس لیے کہ ان میں وہ سارے الفاظ بھی موجود ہیں وہ سب چیزیں بھی موجود ہیں یہاں مسئلہ کوئی نہیں ہے یہاں وہی مفہوم ہے۔ اس سے دو آیتیں پہلے تخت، پایہ تخت ہو گیا اور اس کا لانا فتح کرنا ہو گیا، پلک جھپکنے میں اس کو فتح کرنے کی تاویل بھی ہو گئی۔ یہ سب ہو گیا اور اوپر جو ہدہد گیا تھا دراصل میں رسالوں کے لشکر کا آدمی تھا۔

یہ پرویز صاحب کے ترجمے اور تفسیر کا انداز ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ اب دو باتیں ہو سکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ زبان اور اس کے اسالیب، اس کے مفہوم کو طے کرنے کے طریقوں سے ناواقف محض ہیں یا یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں ماننا نہیں چاہتے ہیں۔ چنانچہ جہاں جہاں وہ ماننا نہیں چاہتے وہاں انہوں نے تمثیل، تشبیہ اور عرف کے یہ اصول اختیار کر کے قرآن کی وہ تشریح کی ہے جس کی تصویر سورہ تکویر کے مفہوم کی صورت میں پیش کی گئی ہے اور جہاں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی وہاں محل بھی شیشے کا ہے وہاں ملکہ سبا آئی بھی ہیں وہ آ کر اس شیشے پر کھڑی بھی ہوئی ہیں انہوں نے سب کام کیے ہیں یعنی وہاں حقیقت اپنی جگہ موجود ہے حالانکہ انکے اصول پر اس کی بھی بہت اعلیٰ تاویل ہو سکتی ہے اس کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ بنیادی اور اصولی چیز ہے جس کی وجہ سے ہم پرویز صاحب کے سارے نقطہ نظر ہی کو ضلالت سمجھتے ہیں اور چونکہ انہوں نے بڑے زور شور کے ساتھ ہمارے نئے تعلیم

یافتہ طبقے کے سامنے جو ان چیزوں کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اسے پیش کیا اس لیے اس کی حقیقت واضح کرنا پڑی۔ قرآن فہمی کے باب میں یہ اتنی بنیادی اور بڑی غلطی ہے کہ اسکے بعد کوئی چیز اپنی جگہ پر باقی نہیں رہتی اس لئے پرویز صاحب کی فکر کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ وہ دین کو سمجھنے کا ایک زاویہ ہے جیسا اس سے قبل امت میں مختلف نقطہ ہائے نظر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کی تعبیر نہ تو علمی ہے اور نہ امت کے اجتماعی تعامل کے مطابق ہے اس لیے اسے اس روایت سے الگ کر کے دیکھنا پڑے گا، جسے ہم امت کی علمی روایت کہتے ہیں۔"

غامدی صاحب نے سورہ التکویر کی مذکورہ بالا آیات کو قیامت کے زلزلے کے ذکر سے منسوب کیا ہے۔ قیامت سے انکی مراد فنائے عالم پر برپا ہونے والی قیامت کبری معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو کم از کم نظام شمسی فنا ہو جائے گا۔ نہ زمین رہے گی نہ آسمان نہ چاند نہ سورج اور نہ ستارے ایسی صورت میں دس ماہہ گابھن اونٹنیاں کہاں اور کس طرح آوارہ پھریں گی، کیونکہ جب زمین ہی فنا ہو جائے گی، تو اس پر موجود ہر چیز، انسان، حیوان حشرات الارض وغیرہ بھی فنا ہو جائیں گے۔ وحشی جانور کہاں اکٹھے ہوں گے؟ سمندر کیسے موجود رہیں گے کہ ابل پڑیں؟ نفوس کی جوڑیں ملائی جائیں گی سے کیا مراد ہے؟ کیا وہ باقی رہیں گے کہ انہیں ملایا جائے گا؟ زندہ درگور لڑکی سے مراد اگر ہر زندہ درگور لڑکی ہے، تو ان سے کیسے پوچھا جائے گا، کیونکہ قبروں کا تو نام ونشان مٹ جائے گا۔ عرب لڑکیوں کو زندہ گاڑ دیتے تھے۔ اسلام نے آکر یہ وحشیانہ عمل بند کر دیا تھا اور اب ایسا نہیں ہوتا۔ اور قیامت کبری کا پتہ نہیں کہ کب برپا ہوگی، کتنے ارب ہا سال کے بعد برپا ہوگی؟ اور کیا آج سے پندرہ سو سال قبل زندہ دفن کی جانے والی بچیاں آئندہ ارب ہا سال تک بھی قبروں میں ہی موجود ہوں گی۔ ان سے تو ظاہر ہوتا ہے، کہ اعمال نامے کھولے جانے میں بھی ابھی ارب ہا سال باقی ہیں اور آسمان کی کھال بھی اسی وقت ہی کھینچی جائے گی۔ اسی وقت دوزخ بھی بھڑکا دی جائے گی، جو اس وقت تک بغیر بھڑکائے ٹھنڈی پڑی رہے گی۔ اسی طرح اس وقت جنت قریب لائی جائے گی تب ہر جان کو پتہ چلے گا کہ وہ کیا لیکر آئی ہے۔ اس مفہوم کی قرآن مجید سے تائید نہیں ہوتی۔

اس زمین پر ہر روز ہزاروں لوگ مرتے ہیں، جس طرح ہر روز ہزاروں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یوں لوگ اپنے اپنے وقت پر پیدا ہوتے ہیں اور اپنے اپنے وقت پر مر جاتے ہیں۔ قرآن مجید پر تدبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی بعث ہے۔ ایمان مفصل کے مطابق البعث بعد الموت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ آیت کریمہ 11/7 میں ارشاد ربانی ہے:

ولئن قلت انکم مبعو ثون من بعد الموت لیقولن الذین کفرو ان ھذا الا سحر مبین

(اور اگر تو کہے کہ تم موت کے بعد پیش ہوتے ہو تو کافر ضرور کہیں گے کہ یہ ایک صریح دھوکا ہے۔)

یوم البعث کا لغات میں معنی یوم القیامۃ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من مات فقد قامت قیامتہ

اس کا ترجمہ امین احسن اصلاحی مرحوم نے یوں کیا ہے: جو شخص مرا اسکی قیامت کھڑی ہوگئی۔

(تدبر قرآن جلد اول سورہ بقرہ کی آیت 202 ہو اللہ سریع الحساب کی تشریح)

قرآن مجید کی آخرت کے موضوع پر تمام آیات سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ اب تک جو لوگ مر چکے ہیں وہ جنت یا دوزخ میں ہیں۔

زیر نظر آیات کا ترجمہ یہ ہے: جب سورج لپیٹا جاتا ہے (اور اسکی روشنی میں کمی واقع ہوتی ہے، یہ کمی داغوں کے بڑھ جانے سے پیدا ہوتی ہے، یہ داغ وسیع ہو کر سورج کو لپیٹ دیتے ہیں 1) اور جب ستارے میلے ہو جاتے ہیں (سورج کی روشنی کی کمی سے وہ ستارے جو اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں گدلے ہو جاتے ہیں۔ روشنی کی کمی سے زمین کی مقناطیسیت میں فرق پڑ جاتا ہے اور کہیں نہ کہیں زلزلہ کا موجب بن جاتا ہے) اور جب پہاڑ اڑائے جاتے ہیں اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنی معطل چھوڑی جاتی ہے۔ اور جب وحشی جانور اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ اور جب سمندر جوش میں لائے جاتے ہیں (زلزلہ کے وقت سمندر جوش مارتا ہے اور بار بار خشکی پر چڑھائی کر کے انسانوں کو بہالے جاتا ہے۔ جس سے بہت سے لوگ مر جاتے ہیں) اور جب (مرنے والے) نفس (اپنے ان اعمال سے جن کو انہوں نے آگے بھیجا ہوتا ہے) جوڑے جاتے

ہیں۔اور جب زندہ گاڑی گئی لڑکی سے سوال ہوتا ہے کہ وہ کس گناہ کے لئے ماری گئی اور جب نامہ اعمال کھولے جاتے ہیں۔اور جب (۶ تحیر کل) آسمان کا اندروں کھولا جاتا ہےاور جب جہنم بھڑکائی جاتی ہے(جو مرنے والے نے اپنے لئے خود ہی تیار کی ہوتی ہے)اور جب جنت قریب لائی جاتی ہے، ہر نفس جان لیتا ہے جو اس نے (آخرت کے لئے) حاضر کیا تھا؟

یہ مفہوم تفسیر بیان للناس سے اخذ کیا گیا ہے۔جو غالباً واحد تفسیر ہے،جس میں سائنسی معلومات سے مطابقت کا التزام کیا گیا ہے۔ان آیات میں جن انقلابات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے چھ تغیرات اس دنیا میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جبکہ باقی چھ موت کے بعد نمودار ہوتے ہیں۔ان انقلابات کے نتیجہ میں زلزلہ وغیرہ کی صورت میں مرنے والے عالم آخرت میں پہنچ جاتے ہیں۔جہنمیوں کے لئے دوزخ بھڑکائی جاتی ہےاور جنتیوں کے لئے جنت قریب لائی جاتی ہے۔جن بچیوں کے حقوق سلب کئے گئے ہوتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے۔کہ

---

(۱) فلکیات جدیدہ و سیر القمر و عید الفطر از محمد موسیٰ روحانی بازی، باب 11،سورج کا بیان:

"اس کی سطح پر داغ ہیں۔۔۔۔ان داغوں اور دھبوں میں تقریباً ہر گیارہ سال کے بعد زبردست طوفان اور بڑے انقلابات رونما ہوتے ہیں،جن کا اثر زمین پر بھی پڑتا ہے.....1947ء کے عالمی سائنسی سال میں کل 3420 داغ (کلف) دیکھے گئے۔ان میں 17 اپریل کو ایک داغ مشاہدہ کیا گیا۔جس کا رقبہ 6,300,000,000 مربع میل تھا۔آج تک اتنا بڑا داغ مشاہدہ میں نہیں آیا۔یہ داغ دراصل سورج کی سطح پر طوفان کی اٹھتی ہوئی موجیں ہیں۔داغ سیاہ دھبوں کی مانند اس لئے نظر آتے ہیں کہ وہ نسبتاً کم گرم ہیں۔1947ء میں ایک زبردست طوفانی موج اٹھی جو برفتار 400,000 میل فی گھنٹہ آفتاب کی سطح سے تقریباً آدھ گھنٹے میں 250,000 میل تک بلند ہوئی۔یہ بلند ترین موج تھی جو مشاہدہ میں آئی۔ان دھبوں کا مشاہدہ دوربین کی ایجاد (1609ء) کا رہین ہے۔یہ عجیب اتفاق تھا کہ دوربین کی ایجاد کے فوراً بعد 1610،1611ء میں سورج کے داغوں کا دور شروع ہوا.....ان داغوں کی حقیقت دو صدی تک پس پردہ رہی۔سب سے پہلے جرمن منجم ہنریخ شراب نے ان کی حقیقت سے پردہ اٹھایا۔اس نے 1843ء میں اعلان کیا کہ تقریباً ہر گیارہ سال کے بعد طوفانی داغوں کا ظہور ہوتا ہے۔بلکہ انتہا تک پہنچنے کے لئے کبھی صرف 10 سال اور کبھی 16 سال درکار ہوتے ہیں۔طوفانی داغوں کے عرصے میں زمین پر مقناطیسی سوئی میں شدید اضطراب اور وائرلیس کے نظام میں زبردست اختلال نمودار ہوتا ہے۔"

وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھیں۔ بچیوں کو ان کا حق نہ دینا ان کا قتل ہے۔ بچیوں کو تعلیم سے محروم رکھنا، ان کی مرضی کے خلاف انکی شادی کرنا، ترکہ سے ان کا حصہ ہضم کرنا..... یہ سب ان کا قتل ہے۔ اور قتل زندگی سے محروم کرنا ہے۔ زلزلہ وغیرہ کی صورت میں جہاں پہاڑ اڑتے ہیں۔ دس ماہ کی گابھن اونٹنی کی حفاظت عظیم گھبراہٹ کی نذر ہو جاتی ہے۔ وحشی جانور بھی دہشت زدہ ہو کر ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ 26 دسمبر 2004 کو بحر ہند کی تہہ میں آنے والے ہولناک زلزلہ کے نتیجہ میں 30 فٹ بلند لہروں کے سمندری طوفان میں پانچ سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے پانی کی دیوار تین ہزار میل دور صومالیہ کے ساحلوں تک جا پہنچی۔ انڈونیشیا، مالدیپ، سری لنکا، میانمار، بنگلہ دیش، بھارت میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ لاکھوں افراد تہہ اجل ہوئے، ہزاروں لا پتہ اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ مالی نقصان بھی نا قابل تلافی ہوا اور ہزاروں بے گھر بھی ہوئے۔

غامدی صاحب نے اذا کا کئی جگہ ترجمہ نہیں کیا جو بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ اذا کے تکرار کا مقصد یہ بتانا ہے کہ یہ انقلابات اور تغیرات الگ الگ واقعات ہیں۔ اذا کو مستقبل کے معنی میں لینا بھی کسی طرح درست نہیں، کیونکہ یہ واقعات ایک دفعہ ہی ظاہر نہیں ہوں گے، بلکہ ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ سورج کے داغوں کے متعلق فلکیات جدیدہ نامی کتاب میں بتایا گیا ہے کہ یہ تقریباً گیارہ سال بعد نمودار ہوتے ہیں۔ اور مرنے والا مرنے کے بعد ہی آخرت میں سزا یا جزا پانے لگتا ہے۔ کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سریع الحساب ہے، سریع العقاب ہے اور مالک یوم الدین ہے، یہ نہیں کہ وہ اب مالک یوم الدین نہیں بلکہ فنائے عالم کے نتیجہ میں برپا ہونے والی قیامت کے دن مالک یوم الدین بنے گا۔ ان آیات میں زمین فنا ہونے کا کوئی اشارہ موجود نہیں۔ پرویز مرحوم کا بھی ان آیات کو مستقبل کے معنے میں لینا صحیح نہیں۔ اجرام فلکی پر پڑے ہوئے پردے تو آئے دن اٹھائے جا رہے ہیں۔ نئی نئی سائنسی ایجادات اور انکشافات سے بھی اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ سائنس کی ترقی سے بہرہ مند قومیں غالب آ رہی ہیں، اور باقی اقوام ان کی تابع مہمل اور غلام بن رہی ہیں۔ اور ذلیل وخوار ہو رہی ہیں۔

غامدی صاحب نے بھی فہم قرآن میں سنگین غلطیاں کی ہیں۔ حتیٰ کی قرآن مجید کی ایک آیت کو جو وصیت کر جانے سے متعلق ہے منسوخ سمجھ لیا ہے، حالانکہ جن آیات سے اسے منسوخ قرار دیا ہے ان میں ہر حصہ کو وصیت پوری کرنے کے بعد تقسیم کرنے کا حکم ہے۔ خیالی جنوں پر ایمان لانے کی تاکید سے مسلمانوں کی توہمات میں مبتلا کرنے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ اور روحانی عاملوں کی ناجائز کمائی کا جواز فراہم کر دیا ہے۔ قوت گویائی سے محروم چیونٹیوں کو سیاست دان بنا دیا ہے اور انہیں سوجھ بوجھ دیدی ہے کہ سلیمان کا لشکر انہیں کچل دینے کے لئے آرہا ہے لہٰذا وہ اپنے گھروں میں گھس کر اپنی جان بچائیں۔ آج تک کبھی چیونٹیوں کے خلاف کسی لشکر نے چڑھائی نہیں کی۔ ایسی باتیں کر کے غامدی صاحب اپنے متبعین کی عقل ماؤف کرنے کا سامان کر رہے ہیں۔

قرآن مجید تدبر کا متقاضی ہے۔ سلیمانؑ کو اگر منطق الطیر کا علم دیا گیا تھا، اور طیر بمعنی پرندے لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ وہ تمام پرندوں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ کیا کوا، کیا گدھ، کیا طوطا، کیا مینا، کیا چڑیا، کیا بلبل۔ مگر فوج میں ان کی بولیاں جاننے سے حاصل کیا ہوتا تھا؟ نظر نہ آنے والے جن سلیمانؑ کے لشکر میں لڑنے کے لئے تھے یا دشمن بادشاہ کو محل سمیت لا حاضر کرنے کے لئے تھے، کیا انہوں نے ایسا کوئی کام سرانجام دیا؟؟ قرآن مجید سے تو واضح ہوتا ہے کہ جن قلعے، عمارتیں، مجسمے، بڑے بڑے برتن بنانے کا کام کرتے تھے۔ جو مزدوروں، معماروں، اور ٹھٹھیروں وغیرہ کا کام ہیں اور جنہیں انسان ہی سرانجام دیتے ہیں۔

غامدی صاحب کا ارشاد ہے کہ وہ پرویز مرحوم کے سارے نقطۂ نظر ہی کو ضلالت سمجھتے ہیں۔ خود اپنے نقطۂ نظر پر بھی غور کریں، تو ان کا نقطۂ نظر جہالت اور ضلالت سے کم نہیں۔ چیونٹیوں کی وادی پر سلیمان سے لشکر کشی کروانا، ایک خیالی مخلوق کو، جسے جن کا نام دیا گیا ہے، اور عام طور پر دیو، بھوت پریت، بھتنی چڑیل اور پری کہلاتی ہے کو نہ ماننے والوں کو مطعون کرنا، لشکر سلیمانؑ میں طیر کو پرندے قرار دینا اسلام کو دین کے بجائے دیگر مذاہب جیسا ایک مذہب منوانے کے مترادف ہے۔ تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب میں

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات قرآن حکیم کی روشنی میں دئے گئے ہیں:

(1) کیا حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے؟

(2) کیا وہ ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی زندہ آسمان پر اٹھا لئے گئے اور قیامت کبریٰ برپا ہونے سے کچھ عرصہ قبل دوبارہ واپس تشریف لائیں گے اور زمین پر خلافت علی منہاج النبوۃ قائم کریں گے؟

(3) کیا تثلیث پرستوں کو حضرت عیسیٰؑ کے متبعین قرار دیا جا سکتا ہے؟

(4) کیا قرآن مجید میں مذکورہ ''جن'' انسانوں اور فرشتوں کے مابین ایک خیالی، پوشیدہ، اور نظر نہ آنے والی مخلوق کے معنی میں لئے جا سکتے ہیں؟

(5) حضرت سلیمانؑ کے لشکر میں ''طیر'' کا لفظ کن معنی میں استعمال کیا گیا ہے؟

(6) کیا قرآن حکیم میں ''النمل'' چیونٹیوں کے معنی میں ہے یا یہ لفظ ایک قبیلہ کا نام ہے؟

(7) کیا سورہ تکویر کی ابتدائی آیات قیامت کبریٰ کے واقعات پر مشتمل ہیں؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

ما رأیکم فی هذا الکتاب؟ نحن فی إنتظاره